© rasailojaraid.com

اسلامی قانونِ میراث اور یتیم پوتے کی محرومی

(قانونِ شرعیہ کی ایک خالص فنّی بحث)

نعیم صدّیقی

اِدھر چند روز سے اسلامی قانونِ میراث کے ایک اہم مسئلے یعنی میّت کے بیٹوں کی موجودگی میں یتیم پوتے کے حرمان کے بارے میں ایک دلچسپ بحث اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ بحث سنجیدہ اور سائنٹفک طریق پر جاری ہوتی، یہ اخباری پروپگنڈے کی گرمے چوگاں بن گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پیشِ نظر مسئلہ کی فنی نوعیت کو، اور اس پر ہونے والی بحث کے محرکات کو پوری طرح سمجھ کر اسے سنجیدہ غور و فکر سے حل کیا جائے۔

چند تمہیدی باتیں

بحث کی ابتداء اس بحث کا دروازہ اوّل اوّل مسلمانوں میں اس وقت کھلا ہے جب سے انگریزی حکومت کے تحت ہندوانہ رواجی قانونِ وراثت نافذ ہوا۔ رواجی قانون سے جہاں مسلمانوں نے یہ اثر لیا کہ لڑکیوں[1] کو بالکل محروم الارث کر کے رکھ دیا (اور لڑکیوں کو شریعت کے دیے ہوئے حقِ وراثت سے محروم کرنے ہی کے لیے وراثت کے شرعی قانون پر مسلمان کھلم کھلا رواجی قانون کو ترجیح دیتے رہتے ہیں۔ نیز قانونِ شریعت کے نفاذ کے بعد بھی لڑکیوں اور بہنوں سے دستبرداری کے بیانات دلوا دلوا کر اُن کی حق ماری کرتے رہے ہیں) وہاں اُن میں میّت کے زندہ بیٹوں کے حصص کے ساتھ اس کے مردہ بیٹوں کے حصوں کو زندہ رکھ کر یتیم پوتوں کو وارث قرار دینے کی تڑپ بھی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ کسی کی بیوہ بہن، یتیم بھانجی یا نواسی،

---

[1] اس بحث کے ایک بڑے محرک (SPONSOR) یعنی مولانا اسلم جیراجپوری نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بیشمار لوگ جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی وراثت میں سابق خاندانی معمول کو بحال رکھا، ان کے لیے اسلامی قانون کو جذب کرنا الجھنوں کا موجب ہوا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ خود یتیم پوتے کی ماں یعنی بیوہ بہو کے لیے کوئی بحث پیدا نہیں ہوتی۔ ساری توجہ یتیم پوتے کے ایک ہی مسئلے پر مرتکز ہے۔ اس سے پہلے پوری تاریخ اسلام و مسلمین میں اس بحث کے آثار نہیں ملتے۔

اس بحث کو باقاعدہ بحث بنانے کا کارنامہ منکرینِ حدیث کے مدرسۂ فکر نے انجام دیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ مُلّاؤں نے سازش کر کے قرآن کے ساتھ ایک وسیع من گھڑت سرمایۂ روایات کو بھی حدیث نبوی اور سنت نبوی کے نام سے بہ حیثیت ماخذ قانون کے لا شامل کیا ہے اس وجہ سے اُن کا فقہی نظام قانونِ الٰہی سے انحراف کر کے کچھ کا کچھ بن گیا ہے، اور اس کے ہر شعبے میں مضحکہ خیز اور لاینحل پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اب ان مضحکہ خیز پیچیدگیوں کے بقا کی وجہ یہ ہے کہ سلف نے جو کچھ کہہ دیا، بعد کے لوگ بے سوچے سمجھے مکھی پر مکھی مارتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ اس مدرسۂ فکر کے متوسلین نظامِ فقہ میں سے کرید کرید کر ایسے مسائل بحث برآمد کرتے رہتے ہیں جن کی اصولی بنیادوں اور جن کی فنی حیثیت کو تو عوام جانتے نہیں، اور نہ جن کے محل و فروع کو اسلامی نظامِ فکر و قانون کے مجموعی ڈھانچے (SET-UP) میں وہ متعین کر سکتے ہیں، اور پھر ان مسائل بحث سے پیدا ہونے والے اشکالات اور پیچیدگیوں کو ـــ جو دنیا کے ہر قانونی نظام کی تفاصیل میں کچھ نہ کچھ بہر حال ہوتی ہیں ـــ نمک مرچ لگا کر اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ لوگوں میں انتشار نمودار ہو جائے۔ اس انتشار سے اشکالات اور پیچیدگیوں کو اصل نظامِ فکر و قانون کے اندر رہ کر حل کرنا مطلوب نہیں، بلکہ اصل مطلوب حدیث اور سنت کے خلاف معرکہ جاری رکھنا ہے۔ سوال یتیم پوتے کو میراث دلوانے کا نہیں، بلکہ سنت کے ترکۂ نبوت سے امت کو محروم الارث کرنے کا ہے۔

حدیث کو مُلّائی سازش قرار دے کر جس بھی مسئلے کی آڑ میں قدیم علمائے اسلام اور جدید مفکرینِ کتاب و سنت کے خلاف محاذ بنایا جائے، بہر حال الحاد پسند (SECULARIST) عناصر کی بن آتی ہے۔ چنانچہ یتیم پوتے کی میراث کے مسئلے پر اخبارات میں ایسے بہت سے لوگ طبع آزمائی فرما رہے ہیں جو منکرینِ حدیث سے دو قدم آگے بڑھ کر سرے سے دین و مذہب کے وجود پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ تیسری طرف ہمارے ایم اے، ایل ایل بی صاحبان ہیں کہ جو شریعتِ اسلامیہ کے نظامِ فکر و قانون پر ایمان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھنے یا اُس کا ضروری علم حاصل کرنے کے لحاظ سے چاہے کسی بھی سطح پر ہوں، لیکن وہ اس کے بنانے اور بگاڑنے کا اختیار ضرور رکھتے ہیں۔ اسمبلی کی رکنیت اُن کو جو اختیارات دیتی ہے اُن کے استعمال کی جو تربیت اب تک ہمارے ایم، ایل اے حضرات کو ملی ہے وہ یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ ذاتی اور خاندانی مفاد کی خدمت کے ساتھ اپنی ساکھ بنانے کے لیے کچھ "شاندار کارنامے" بھی سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ عوام خصوصاً اپنے حلقے کے ووٹروں کی خواہشات اور نفسیات کو سامنے رکھ کر ان کو خوش کرنے والا کوئی مسودۂ قانون پیش کر دیتے ہیں۔ یہ مشق عام دنیاوی مباحات کے دائرے میں تو جاری تھی ہی، اب خود اسلام اور شریعت سے بھی یہ دل لگی ہونے لگی ہے۔

چنانچہ یتیم پوتے کو چچاؤں کے پہلو بہ پہلو وراثت دلوانے کے لیے جو خواہش ہمارے عوام — بالخصوص زرعی آبادی کے حلقوں — میں کارفرما ہے، اُسے اقبال چیمہ صاحب نے اچھی طرح بھانپ کر منکرینِ حدیث کے استدلال کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کے شرعی قانونِ وراثت میں ترمیم کے لیے ایک مسودۂ قانون پنجاب اسمبلی میں داغ دیا ہے۔ یہ ترمیمی مسودۂ قانون اب چونکہ رائے عام معلوم کرنے کے لیے معلق چھوڑا گیا ہے، اس لیے منکرینِ حدیث، مخالفِ دین عناصر، عام مقالہ نگار بلکہ خطوط نگار اخبارات میں اس مسئلہ پر طبع آزمائی کر رہے ہیں اور بحث بالکل عامیانہ سطح پر آ گری ہے۔

اگر آپ اس بحث میں حصہ لینے والوں کا تجزیہ کریں تو حسبِ ذیل عناصر سامنے آئیں گے:۔

ایک گروہ اس مسئلے کے موقف سے حدیث اور سنّت کے خلاف معرکہ آرا ہے۔

ایک گروہ اس بحث کے ذریعے "ملّا ازم" کے خلاف جہاد میں مصروف ہے۔

ایک گروہ اس جھگڑے کی آڑ میں سرے سے دین و مذہب ہی کے خلاف ایک فضا پیدا کرنے میں مصروف ہے۔

ایک عنصر محض زرعی آبادی کے ووٹروں کو خوش کرنے کے درپے ہے۔

ان عناصر کے علاوہ کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہیں جو دیانت داری سے یتیم پوتے کے مسئلے کو سمجھنا چاہتے ہیں، اور جو اشکال اس میں واقع ہو رہا ہے اس کا کوئی حل شریعتِ اسلامی کی رہنمائی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بحث کی دو صورتیں ان سب عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ گذارش کریں گے کہ بحث کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

ایک صورت یہ ہے کہ آپ اسلام کو اپنا دین مانتے ہوں، قرآن اور سنت دونوں کو شریعت کے مآخذ کی حیثیت دیتے ہوں، اور پھر سوال یہ چھیڑیں کہ ان مآخذ سے تفقّہ اور استنباط اور اجتہاد کر کے جو قانون بنایا گیا ہے اس میں ایک یا چند مسائل میں ماہرین کی فکر نے کوتاہی کی ہے، یا اصولوں کو عملی تفاصیل پر منطبق کرنے میں سہو ہو گیا ہے، لہٰذا اب از سرِ نو غور کر کے کسی اشکال یا پیچیدگی کو اسلامی نظامِ فقہ و قانون کے اندر رکھ کر حل کیا جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ سرے سے اسلام کو بہ حیثیت نظامِ زندگی کے مانتے ہی نہ ہوں، یا اسے ایک یادگارِ کہن سمجھتے ہوں، یا صرف قرآن کو سند تسلیم کریں اور قرآن کی عملی تشریح کی حیثیت سے سنتِ نبوی کو مآخذِ قانون ماننے ہی میں اصولی اختلاف رکھتے ہوں، اور اس رائے کے نتیجے میں یہ سمجھتے ہوں کہ پورا نظامِ شریعت ہی غلط بن گیا ہے، یا آپ فقہ و قانون کو ملّائی خرافات قرار دیں۔ اور اپنے ان نظریات کے لیے جنگ لڑنے میں یتیم پوتے کی میراث کے مسئلے کو محض آلہ اور ذریعہ بنا کر استعمال کریں، یا یہ کہ اسے محض بطور مثال یا دلیل سامنے لائیں۔

اگر صورتِ بحث دوسری ہو تو پھر ایک جزئی مسئلہ اگر آپ کے حسبِ منشا بھی حل کر لیا جائے، یا اس کے برعکس اس کی صحت و معقولیت خود آپ کی سمجھ میں بھی آ جائے تو بھی اصل بنیادی جھگڑا جس کا میدان بڑا وسیع ہے جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ ایک جزئی مسئلہ طے ہو جانے کے بعد وہ بنیادی جھگڑا پھر کسی اور جزئی مسئلے میں چھڑ جائے گا۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ بنیادی اختلاف رکھنے والے حضرات اپنی لڑائی بنیادی بحث ہی کے میدان میں لڑیں۔ پھر اگر اختلاف رفع ہو جائے تو بہت خوب، ورنہ وہ جس دوسرے نظامِ فقہ و قانون کو چاہیں اختیار کر لیں، اور اسلام کو نظامِ زندگی ماننے اور قرآن کے ساتھ سنّت کو ماخذ تسلیم کرنے والے مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاں، اگر بحث کی صورت یہ ہو کہ اسلام پر ایمان رکھنے اور قرآن و سنت کو بنیادی مآخذ ماننے میں اور شریعت کے نظامِ فقہ و قانون پر مجموعی اعتماد رکھنے میں اتفاق ہو اور سارا قضیہ یتیم پوتے کی میراث تک محدود ہو تو پھر ہم اس بحث میں دلچسپی لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور ہم منکرینِ حدیث اور ملحدین کے محاذ سے قطع نظر کر کے اخلاص مند عنصر کو اصل مخاطب بنا رہے ہیں۔

ہمارا نظامِ فقہ و قانون

اس مسئلے پر جو مناظرانہ اور اخباری بحثیں دیکھنے میں آ رہی ہیں اُن کی سطحیت تقاضا کرتی ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظامِ فقہ و قانون کی مخصوص نوعیت کو واضح کر دیا جائے۔

یہ ایک الٰہی دینی نظامِ قانون ہے۔ اس کی بنیادیں خدا و رسول کی مقرر کردہ ہیں اور اس کے نشو و نما کے لیے حدود لگا کر راستے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ سبزۂ بیگانہ کی طرح ہر طرف نہیں پھیل سکتا، بلکہ منضبط طریق پر ترقی کرتا ہے۔ اس کا میدان بالکل آزاد اور بے قید انسانی تفکر کے جولانیاں دکھانے کا میدان نہیں۔ اس میدان میں قدم دھرنے سے قبل انسانی فکر کو کچھ اصول و حدود کی پابندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں، اور خدا اور رسول کی دی ہوئی حکمتِ قانونی پر ایمان لانا پڑتا ہے، نیز اسلامی مآخذِ قانون کو اسی ترتیب سے قبول کرنا پڑتا ہے جو ترتیب شارع (LAW GIVER) نے مقرر کر دی ہے۔

یہ نظامِ قانون ایسا کھلونا بہرحال نہیں ہے کہ اس میں سطحی قسم کے انسانی جذبات جدھر سے چاہیں مداخلت کرتے رہیں۔ آج ایک جذبہ کی لہر اُٹھی تو آپ نے کہا کہ اس میں فلاں تبدیلی ہونی چاہیے، کل ایک دوسرا جذبہ متحرک ہوا تو آپ تقاضا کرنے لگے کہ اس کا رُخ ادھر سے اُدھر کو بدل دیا جائے۔ جس کا جو خیال پیدا ہوا اُس نے اس کے حق میں پروپیگنڈا کیا، رائے عام کو اپنی حمایت میں لیا۔ ایک مسودۂ قانون پیش کر دیا، تقریریں ہوئیں، رائے شماری عمل میں آئی اور بس ایک نیا ایکٹ بن گیا —— اور پھر جو بھی نیا ایکٹ بن گیا وہ اسلامی قانون ٹھہرا۔ قانون کو کسی بھی معاشرے نے اس طرح موم کی ناک اور سطحی جذبات کا کھلونا نہیں بننے دیا ہے، کجا کہ اسلامی نظامِ فقہ و قانون!

اس نظامِ فقہ و قانون کے بارے میں دین کے مخالفوں اور منکرینِ حدیث وغیرہ نے یہ جو تصور پھیلا رکھا ہے کہ عقل سے کام نہ لینے والے چند مسجد گیر ملاؤں کے تیر تکے پرانی کتابوں میں لکھے چلے آ رہے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بعد کے لوگ لکیر کی فقیری میں مبتلا ہیں، اس تصور کے بارے میں کم سے کم سنجیدہ مزاج اور علمی ذوق رکھنے والوں کو جان لینا چاہیے کہ یہ بازاری قسم کی خرافات سے زائد کچھ نہیں۔ یہ نظامِ فقہ و قانون جسے آج آپ ایسی کتابوں کے اوراق میں دیکھتے ہیں جو ہماری تعلیم گاہوں کے نصاب سے خارج اور ہماری حدودِ مطالعہ سے باہر ہو گئی ہیں، یہ کچھ عرصہ قبل اسی طرح نافذ العمل تھا جس طرح آج اینگلو سیکسن نظامِ قانون ہمارے ہاں رائج ہے۔ یہ باقاعدہ اسلامی ریاست کی مجالس شوریٰ (PARLIMENTS) اور مجالسِ فقہا (LAWYER ASSEMBLEES) میں زیرِ بحث آ کر مدون ہوا ہے، اور فاضل ججوں اور قانون دانوں نے اس کے اصولوں کو عدالتوں میں پیش آئند مقدمات پر منطبق کر کر کے ایک خاص وسعت تک پہنچایا ہے۔ یہ مسجدوں کے حجروں میں نہیں، بلکہ حکومت کے ایوانوں، یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں (RESAARCH INSTITUTES) اور عدالتوں کے گہواروں میں ٹھیک اسی شان سے پلا ہے جس شان سے آج کی کسی حکومت کا قانون پروان چڑھتا ہے۔ ایک ایک شعبہ میں اس کے اصول متعین کیے گئے ہیں، حکمتیں اور مصلحتیں سامنے لائی گئی ہیں، فنی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں، ایک خاص زبان اس کے لیے نشوونما پا گئی ہے، اور خاص فنی مسائل اور قانونی پیچیدگیاں بالکل فطری طور پر ابھری ہیں جن پر ماہرین نے وسیع سرمایۂ فکر و نظر چھوڑا ہے۔ پھر واقعہ یہ نہیں ہے کہ مکھی پر مکھی ماری گئی ہے بلکہ برعکس اس کے فقہا اور ماہرینِ قانون کے درمیان بڑی بڑی اختلافی بحثیں پائی جاتی ہیں متفقہ اصولوں پر جمع ہونے کے باوجود تفاصیل میں آراء کا فرق نمایاں ہے، یہاں تک کہ چار بڑے بڑے مستقل مدارسِ فکر ہماری فقہ میں پیدا ہو گئے ہیں اور پھر خود ان میں داخلی طور پر بھی اجتہادی اختلافات موجود ہیں۔

بعد میں یہ نظامِ فقہ و قانون جب نافذ العمل نہ رہا تو اس کا نشوونما اسی طرح رک گیا جس طرح کوئی بھی دوسرا قانون عملی زندگی سے خارج کیے جانے پر فطری نشوونما سے محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن آج بھی اس کے سرچشموں کی روانی، اس کے اصولوں کی مضبوطی اور اس کی صلاحیتِ نشوونما میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ آج جو لوگ اسے روایاتی ڈھکوسلا اور ملائی سازش کی پھبتیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں، وہ صرف اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ انہوں نے اس نظامِ فقہ و قانون کا مطالعہ کر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی پائداری اور عظمت، اس کی معقولیت اور اس کی وسعت و جامعیت کو نہیں جانا۔

اس کے قانون کا بنیادی ڈھانچہ جن اجزا سے بنتا ہے وہ یہ ہیں:-

(۱) نصوص، یعنی:-

الف:- قرآن کے صریح احکام، ہدایات اور منہیات، مطلوبات اور ممنوعات

ب- رسول اللہ صلعم کے قول و فعل سے صراحۃً ثابت ہونے والے احکام و منہیات؛

یہ وہ بنیادیں ہیں جن کو جوں کا توں پورے جذبۂ تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کر لینا اسلامی قانون کو معلوم کرنے، یا اس کی تعبیر کرنے، یا اس کے عملی حالات پر منطبق کرنے، یا اجتہادی رائے قائم کرنے ہی کے لیے نہیں، عین مسلم ہونے کے لیے شرطِ اوّل ہے۔ چنانچہ ہمارے نظام فقہ و قانون میں نصوص کے صریح اوامر و نواہی کو جوں کا توں قبول کر کے ساری اٹھان انہی کے اوپر اٹھائی گئی ہے۔

(۲) اجماع، یعنی:-

نصوص کے صریح احکام کے اشارات اور دلالات سے جو اصول، مقاصد، مستلزمات، حِکَم و مصالح، لازمی نتائج کے طور پر سامنے آنے والے اہم قانونی نکات اور اجتہادات و استنباط کے کلیات اخذ ہوں، اُن میں سے جس جس چیز کے ایک مرتبہ اسلامی شوریٰ اور اسلامی عدالتوں کے اختیار کر لینے کے بعد کامل اتفاق سے مسلسلاً قبول کر لیا گیا ہو اور بعد کے ارباب حل و عقد، مجالس شوریٰ اور اسلامی عدلیہ (JUDICIARY) کے اداروں، نیز ماہرین قانونیات (JURISTS) نے جس کی پاسداری کی ہو، وہ اجماعی اصول یا فارمولا بن جاتی ہے[1]۔ چنانچہ ہمارے ہاں ہر قانون کچھ کلیات

[1] واضح رہے کہ اجماع اسے نہیں کہتے کہ چند مولوی یا مفتی کسی فتوے پر مل کر دستخط کر دیں۔ بلکہ اصلاً اجماع کی اصطلاح ایک سیاسی اور قانونی اصطلاح ہے۔ بعد میں اس کا ایک ضمنی استعمال یہ بھی رائج ہوا ہے کہ علمی دائرے میں تمام ماہرین و مفکرین اپنے اختلاف کو جن متفقہ اصول و کلیات سے محدود رکھتے ہیں اُن کے لیے اجماع کی اصطلاح برتی جاتی ہے۔ "اجماع" ہر نظام قانون کا ایک اہم عامل ہے۔ اس کی حقیقت کو سمجھنے میں ایک تازہ ترین مثال بڑی مدد دے سکتی ہے۔ پنجاب ہائی کورٹ نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کی اپیل کو خارج کرتے ہوئے ربانی گلے صفحہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور فارمولوں پر قائم ہوتا ہے اور اس کے اندر واقع ہونے والے اختلافات کو یہ کلیات اور فارمولے ایسی حدود میں محدود رکھنے کا پارٹ ادا کرتے ہیں جن کے ذریعے اس نظام قانون میں استقلال (STABILITY) پیدا ہو ہے۔ ورنہ اگر مجالس شوریٰ یا اسمبلیاں اپنے ہر اجلاس میں، اور عدالتیں اپنی ہر کارروائی میں بار بار کلیات اور فارمولوں کو توڑتی رہیں اور نت نئے کلیات اور فارمولے وضع کرتی رہیں تو قانون کا کوئی مستقل ڈھانچہ بن ہی نہیں پاتا پھر وہ ریت کا ایک گھروندا بن کے رہ جاتا ہے۔

کلیات اور فارمولوں کو جب ایک مرتبہ اختیار کیا جاتا ہے تو پھر وہ قانون کے پورے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کو کوئی بھی رائے قائم کرنے، فیصلہ دینے، اجتہاد کرنے یا کسی مقدمے میں کوئی نظیر قائم کرنے کے عمل میں پوری طرح پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ کلیات اور فارمولے کہیں نہ کہیں تفاصیل میں جا کر جب باہم دگر متاثر ہوتے ہیں تو کچھ نہ کچھ پیچیدگیاں ہر کلیے اور ہر فارمولے کو پیش آتی ہیں لیکن دنیا کے کسی بھی نظام میں یہ حماقت نہیں کی جاتی کہ جہاں کسی کلیے یا فارمولے کی وجہ سے کوئی پیچیدگی سامنے آئی تو اسے چھوڑ کر جھٹ ایک نیا متضاد کلیہ یا فارمولا گھڑ لیا۔ بلکہ کلیات اور فارمولوں کے بنیادی ڈھانچے کو برقرار رکھ کر اسی کے اندر رہتے ہوئے پیچیدگیوں کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اجماع کا انسٹی ٹیوشن اسلامی نظام قانون کو ایک مستقل ڈھانچہ فراہم کرنے کے لیے نصوص ہی سے اخذ کردہ متفق علیہ کلیات اور فارمولے سامنے لاتا ہے۔ ان کلیات اور فارمولوں کے باہمی تعامل سے تفاصیل میں کہیں نہ کہیں پیچیدگیاں بھی نمودار ہوتی ہیں لیکن ان پیچیدگیوں

(بقیہ حاشیہ) لاہور کے مارشل لاء کے بارے میں جو ریمارکس دیئے تھے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ مارشل لاء عام عدالتوں کے متوازی اپنی عدالتیں بٹھا کر انسدادی سزاؤں کے ساتھ تعزیری سزائیں نافذ کرنے اور قیام امن کے لیے "ضرورت" کی حد سے آگے جا کر مختلف کارروائیاں کرنے کی وجہ سے اینگلو سیکسن سسٹم آف لاء کے لیے بالکل اجنبی ہے یعنی انگلش سسٹم آف لاء جن کلیات اور فارمولوں پر قائم ہے اور جن کے خلاف نہ کسی پارلیمنٹ نے کبھی کوئی قانون سازی کی ہے، نہ عدالتوں نے کبھی فیصلہ دے کر کوئی نئی نظیر قائم کی ہے۔ —— یا دوسرے لفظوں میں اینگلو سیکسن سسٹم آف لاء کا جزء جن چیزوں پر اجماع ہے —— یہ مارشل لاء ان کے مطابق تو نہیں ہے! اس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "اجماع" ہر نظام قانون کا ایک لازمی اصول ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی وجہ سے نہ اس قانون کو ملائی ڈھکوسلا اور سازش کی پھبتیوں کا نشانہ بنانا کوئی معقول حرکت ہو سکتی ہے، اور نہ ان جزئی چیزوں کی خاطر قانون کے مجموعی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر نیا ڈھانچہ بنانے میں لگ جانا اجتہاد کے حق کو استعمال کرنے کی کوئی صحیح صورت ہے۔ ان جزئی پیچیدگیوں کو بہرحال اسلامی نظامِ فقہ و قانون کے مجموعی فریم میں رکھ کر اجماعی کلیات اور فارمولوں کے تحت ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

اب اگر کچھ لوگ سرے سے اجماع کے انسٹی ٹیوشن ہی کو نہ مانیں، یا جن کے نزدیک سنّتِ رسولؐ ماخذِ قانون ہی نہ ہو، اُن کے لیے تو ہمارے نظامِ فقہ و قانون سے دلچسپی کی کوئی وجہ ہی نہیں اور نہ اُن سے بحث کی کوئی بنیاد باقی رہ جاتی ہے۔ اُن کو حق پہنچتا ہے کہ وہ نئے کلیات اور فارمولے بنا کر پورا ڈھانچہ ہی از سرِ نو مرتب کریں۔ لیکن جو لوگ سنّتِ رسولؐ کو نص ہی کا درجہ بھی دیں، اجماع کے انسٹی ٹیوشن کو بھی واجب الاحترام سمجھیں، نیز قانون کے مجموعی ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے کسی مسئلے کو حل کرنا چاہیں اُن کے لیے لازم ٹھہرتا ہے کہ وہ:-

ا۔ کسی معاملے پر بحث چھیڑیں تو نصوص اور ان کے اشاراتی اور دلالاتی تقاضوں کو جانیں،

ب۔ جو کلیات اور فارمولے اجماع کا درجہ رکھتے ہوں اُن کے دُور رس اثرات کا فہم پیدا کریں اور ان کی حدود میں رہ کر سوچ بچار کریں،

ج۔ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے قانون کے مجموعی ڈھانچے کی ترتیب کو سمجھیں،

د۔ اور اگر خود قانون کی فنی بحثوں کے لیے تفصیلی علم نہ رکھتے ہوں تو یا تو علم حاصل کرنے پر متوجہ ہوں، یا پھر واقعی علم رکھنے والوں سے استفادہ کریں۔

یہ معاملات بہرحال سطحی جذباتی ہنگاموں اور عامیانہ اخباری پروپیگنڈے کا تختۂ مشق بننے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔

اصل مسئلہ فقہ اسلامی کے فریم میں

ہمارا قانونِ میراث کسی بھی نظامِ قانون میں اگر آپ کیڑے نکالنے پر تُل جائیں تو یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ تفصیلات کے میدان میں بہت سی چیزوں کو آپ نامعقول کہہ سکتے ہیں، بہت سے احکام اور فیصلوں کا مذاق اڑا سکتے ہیں، اور ایسی چند چیزوں کے ہاتھ لگ جانے پر، آپ کو اس سے بھی کوئی نہیں روک سکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اُس نظامِ قانون کے سارے دفترِ علم و تحقیق کو بے معنی قرار دے کر پرے پھینک دیں لیکن اگر آپ سنجیدگی اور انصاف سے کام لے کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قرآن کی چند آیات اور رسول اللہ صلعم کی چند احادیث کو بنیادی سرچشمۂ ہدایت مان کر، اُن سے احکام، اصول اور بنیادی مصلحتیں اخذ کرنے میں اسلامی قانونِ میراث کے مرتب کرنے والوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ رشتوں اور تعلقات میں سے ایک ایک کی درجہ بندی کرکے اُن کی صفیں بنادی ہیں، تمام ممکن ورثا کی فہرست اولیت (SENIORITY) اور اخرویت (JUNIORITY) کے لحاظ سے پورے استدلال کے ساتھ مرتب کر دی ہے، اصطلاحات مقرر کی ہیں، میراث کی خاص ریاضی مدوّن کر دی ہے۔ چنانچہ ہمارے ماہرینِ قانون نے ایک اسی قانون کے دائرے میں اتنا وسیع لٹریچر چھوڑا ہے اور مطالعہ و تحقیق کے لیے اتنا مواد بعد والوں کو بہم پہنچا دیا ہے کہ اس پر صرف اسپیشلائز کرنے والے علماء ہی حاوی ہو سکتے ہیں۔ ہمارا قانونِ میراث صحیح معنوں میں ایک سائنس ہے جو ٹھیٹھ سائنٹفک انداز سے پروان چڑھی ہے۔ اس سائنس کا جب بھی مطالعہ کیا جائے، یا اس کے مسائل میں جب بھی اظہارِ رائے کیا جائے تو سنجیدہ اور سائنٹفک انداز (APRROACH) اختیار کرنا چاہیے۔

ہمارے قانونِ میراث کے چند اجماعی فارمولے اور کلیات جس طرح ہم نے اوپر تفصیل سے بیان کیا تھا، ہمارے قانونِ میراث کا ڈھانچہ بنانے میں چند فارمولوں اور کلیات کو استعمال کیا گیا ہے۔ اِن فارمولوں اور کلیات پر ازاوّل تا آخر مجالس شوریٰ اور عدالتوں اور علمائے قانون کا اتفاق رہا ہے اور ان کو ہمیشہ ہمارے نظامِ فقہ و قانون میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ہم کہیں گے کہ ان پر "اجماع" ہے۔ یہاں ہم بحث سے تعلق رکھنے والے چند کلیات کو پیش کرتے ہیں:۔

پہلا کلیہ سورۂ نساء کے رکوعِ اوّل میں "مما ترک الوالدان والاقربون" کا دو بار آیا ہوا ٹکڑا، نیز دوسری تمام متعلقہ آیات میں قرابت کے رشتوں کی بنا پر حقِ وراثت کا تعین صاف بتاتا ہے کہ یہ حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہ "قرابت" ہے۔

دوسرا کلیہ قرابت کو میراث پانے کے حق کی بنیاد مانتے ہی یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ آیا ایک میّت

لہ چنانچہ فنِ میراث کے خصوصی ماہرین کو [illegible] کہا جاتا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ترکہ میں سے اس کے تمام کے تمام قرابت دار بہ یک دم حصہ پائیں گے یا بعض کے ہوتے ہوئے بعض محروم رہیں گے، نیز کیا سب کا حصہ مساوی یا نہ ہوگا؟ صریح نصوص سوال کے ان دونوں اجزا کا جواب نفی میں دیتی ہیں۔ نصوص ہی کی رہنمائی سے ماہرین قانون (JURISTS) نے حسب ذیل دو باتیں علم میراث کے اساسیات (FUNDAMENTALS) کے طور پر طے کرکے ان پر اجماع کر لیا ہے کہ:-

الف) کسی میت کے تمام کے تمام اقربا یا ممکن ورثا بہ یک دم میراث نہیں پا سکتے، بلکہ درجۂ قرابت میں جو مقدم ہیں، وہ مؤخرین کو کلاً یا جزءً محروم کرتے ہیں یعنی جس متعین حصے یا کل ترکے کو پانے کے لیے زیادہ قریبی وارث موجود ہوں گے، وہ دور والوں تک نہیں پہنچے گا۔

ب۔ کسی میت کے قانوناً وارث قرار پانے والے اقربا اگر درجۂ قرابت کے لحاظ سے یکساں نہ ہوں تو ان کا حصہ مساوی یا نہ نہیں ہو سکتا بلکہ تعلق کے قرب و بعد کے لحاظ سے کم و بیش ہوگا۔

قرابت کے فرقِ مراتب کو سب سے پہلے سورۂ نساء کی آیت مذکورۂ بالا کا ٹکڑا "مما ترک الوالدان والاقربون" واضح کرتا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے شارع نے رہنمائی دے دی کہ قرابت داری کے دوسرے تمام مدارج پر ابوّت (یعنی اپنے والدین سے وراثت پانے کا حق قائم کرنے والے تعلق) کو فوقیت حاصل ہے، اسی لیے اقربا کی تمام صنف میں سے والدین کو الگ کرکے اوّلین مرتبہ دیا گیا ہے۔ پھر "واولوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ" میں صراحت کر دی گئی کہ تعلقاتِ رحمی کے مدارج مختلف ہیں۔ اسی حقیقت سے "الاقرب فالاقرب" کا اصول ماخوذ ہے۔ اور اس اصول پر قطعی اجماع ہے۔

مدارج قرابت قرابت کے بیچ فرقِ مراتب کو تسلیم کر لینے کے بعد لازم ٹھہرا کہ قانون میں اس فرق کو تفصیل سے واضح کیا جاتا۔ چنانچہ ماہرین نے خود نصوص ہی سے روشنی حاصل کرکے بڑے سائنٹفک طریق سے اقربا کے مدارج مقرر کیے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کو تین صنفوں میں تقسیم کیا گیا ہے:-

پہلی صنف وارث بننے والے اُن اقربا کی ہے جن کو ذوی الفروض کہتے ہیں۔ یہ وہ اقربا ہیں جن کے حصے قرآن میں متعین طور پر بیان کر دیے گئے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ان لوگوں کے متعین حصے الگ کر دیے جاتے ہیں، بقیہ حقوق باحرا ب بعد میں ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری صف وارث بننے والے اُن اقربا کی ہے جن کو عصبات (RESIDUARIES) کہتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو ذوی الفروض کے متعین حصے ادا ہونے کے بعد بقیہ ترکہ پاتے ہیں، یا اُن کی عدم موجودگی میں کُل ترکہ پاتے ہیں۔

عصوبت کے حق کے لیے استدلال کا سرچشمہ ذیل کی نصوص ہیں:-

(۱) سورۂ نساء کے رکوع ۲ کی آیت یوصیکم اللہ فی اولادکم ۔۔۔ الخ میں یہ ٹکڑا کہ "فان لم یکن لہ ولد وورثہ ابواہ فلامہ الثلث" باپ کو جس بنیاد پر وارث بناتا ہے اسی کے لیے عصوبت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ بخلاف اس کے میت کی ماں صاحبۂ فرض ہوئی، کیونکہ اس کے لیے ⅓ متعین کر دیا۔

(۲) ابن عباسؓ کی روایت "الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھو لاولی رجل ذکر" میں قریب ترین درجۂ قرابت کے مرد کو جو استحقاق خصوصی دیا گیا ہے وہ عصوبت کا استحقاق ہے یعنی ذوی الفروض کے متعین حصے ادا کرنے کے بعد عصبہ کو وراثت ملے گی۔

(۳) حضرت عمرؓ کی روایت کہ آپ نے نبی صلعم کا یہ ارشاد سنا کہ "ما احرز الوالد والولد فھو لعصبتہ من کان" (یعنی جو کچھ مال باپ یا بیٹے کا جمع کردہ ہو تو وہ اس کے عصبہ کا ہے، جو بھی ہو) عصبات کی ایک مستقل حیثیت متعین کرتی ہے۔

(۴) روایت بخاری "واجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ" (یعنی جب محض لڑکیاں وارث ہوں، لڑکا کوئی نہ ہو تو بہنوں کو ان کے ساتھ عصبہ قرار دو) بھی مرتبۂ عصوبت کے لیے ایک واضح دلیل اور سند ہے۔

تیسری صف وارث بننے والے اُن اقربا کی ہے جن کو اولوالارحام (DISTANT KINDREDS) کہتے ہیں۔ یہ وہ رشتہ دار ہیں جو نہ تو ذوی الفروض ہیں ہوں، نہ عصبات کے مقام پر بلکہ جن کا تعلق قرابت کسی عورت کے واسطے سے میت کے ساتھ قائم ہوتا ہو۔ یہ ذوی الفروض اور عصبات کی دونوں صفوں کی عدم موجودگی میں ترکہ پاتے ہیں۔ ان کا استحقاق ذیل کی نصوص سے ثابت ہے:-

(۱) "للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب ۔۔۔۔۔ الخ"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(ترجمہ :- مردوں کا حصہ ہے اس مال میں جو باقی چھوڑیں ان کے والدین اور اقربا، اور عورتوں کا حصہ ہے اس مال میں جو باقی چھوڑیں ان کے والدین اور اقربا) میں یہ حقیقت کہ لفظ "اقربون" قرابت کے سارے مراتب پر حاوی ہے، نیز "للنساء" کی یہ توضیح کہ عورتیں بھی سلسلۂ وراثت میں داخل ہیں، اولوالارحام کی صف کو ایک مقام دیتی ہے۔

(۲) سورۂ انفال کی آیت " واولوالارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتٰب اللہ " (ترجمہ :- قرابت رحمی رکھنے والے رشتہ دار خدا کے قانون کے تحت ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں) کے الفاظ مزید صراحت کر رہے ہیں۔

(۳) نبی صلعم کا یہ ارشاد کہ " الخال وارث من لا وارث لہ " - بخاری (ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی اور وارث نہ ہو) قطعی طور پر دال ہے کہ ذوی الفروض اور عصبات کی عدم موجودگی میں اولوالارحام حسب مراتب وارث ہونگے۔

تقسیم در تقسیم چونکہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی وارث ایک طرف سے ذوی الفروض میں داخل ہے، دوسری طرف سے عصبات میں، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا مقام بہ یک وقت عصبات میں بھی ہو اور اولوالارحام میں بھی، نیز چونکہ خود ذوی الفروض، عصبات اور اولوالارحام کی صفوں میں داخلی طور پر تقدم و تاخر پایا جا سکتا ہے، اس لیے تینوں صفوں کو پھر تین تین درجات (GRADES) میں تقسیم کر کے کل ۹ گروپ بنا دیئے گئے ہیں۔ تفصیل یہ ہے :-

طبقات / اقسام ورثاء	ذوی الفروض	عصبات	اولوالارحام
طبقۂ اول (یعنی میت کے فروع)	خاوند، بیوی، بیٹی، پوتی وغیرہ	بیٹا، پوتا، پڑپوتا وغیرہ	بیٹی کی اولاد، پوتی کی اولاد وغیرہ
طبقۂ دوم (یعنی میت کے اصول)	ماں، باپ، دادا، دادی، نانی وغیرہ	باپ، دادا، پردادا وغیرہ	نانا، نانی کا باپ، نانا کا باپ وغیرہ
طبقۂ سوم (یعنی میت کے ماں باپ کے فروع)	بہن حقیقی، بہن علاتی، بھائی بہن اخیافی	بھائی حقیقی، بھائی علاتی، ان کی اولاد ذکور	بھائی بہنوں کی اولاد (سوائے حقیقی اور علاتی بھائیوں کی اولاد ذکور کے)

پھر ان طبقات اور صفوں کے ہر گروپ کے اندر ایک رشتہ دار کے تقدم و تاخر کو متعین کیا گیا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس تحقیقی کام کی تکمیل کے لیے نصوص کے ان اشارات سے بھی مدد لی گئی ہے جو نکاح و طلاق، رضاعت، ولایت، وکالت وغیرہ کے سلسلے میں رشتوں کی درجہ بندی کرنے میں کچھ بھی مدد دیتے ہیں۔

ان گروپس میں سے اگر سرے سے کوئی رشتہ دار موجود نہ ہو تو پھر چند شاذ صورتیں غیر رشتہ دار لوگوں کے ورثہ پانے کی ہیں، وہ بھی نہ ہوں تو آخری صورت میں پوری مسلم سوسائٹی (اسلامی بیت المال) وارث ہے۔

یہ تفصیل اس لیے دی گئی ہے کہ یہ حقیقت سمجھی جاسکے کہ قانونِ میراث ایک وسیع مرتب ڈھانچہ (STRUCTURE) رکھتا ہے، اور کوئی نئی چیز اس صورت میں اختیار کی جاسکتی ہے جبکہ وہ اس ڈھانچے میں اپنی جگہ بنا سکتی ہو۔ وہ چیزیں جو جزوی تبدیلی کے بجائے پورے ڈھانچے کو توڑ کر داخل کی جاسکتی ہوں، ان کے لیے اس ڈھانچے میں جگہ نہیں ہے۔

تیسرا کلیہ اوپر کی تقسیم مراتب کتاب و سنت کے جن صریح احکام یا اشارات و دلالات پر مبنی ہے اُن کی رُو سے لازم آتا ہے کہ اگر ایک ہی طبقے، ایک ہی صف یا ایک ہی گروپ کے چند ایسے ممکن وارث موجود ہوں جن میں سے کچھ مقدم ہوں، کچھ موخّر، تو مقدمین سارا ترکہ (یا اس کا وہ خاص حصہ جس کا معاملہ زیرِ غور ہو) لے جائیں گے اور موخّرین وارث نہیں ہوں گے۔ اس اصول کو "الاقرب فالاقرب" (پہلے قریب کے، پھر دور کے) کے الفاظ میں طے کیا گیا ہے۔ اور اس پر قطعی اجماع ہے۔

اس اصول کے تحت قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص کا رشتہ میت سے کسی دوسرے شخص کے واسطے سے ہو تو شخصِ متوسط مقدم ہوگا اور مذکرہ شخص کو موخر کر دے گا۔ چنانچہ یہی کلیہ ہے جو آگے چل کر کلیۂ "حجیب" (یعنی کسی ممکن وارث کے ترکہ پانے میں اس سے قریب درجے کے وارث کا جزئاً یا کلاً حائل ہو جانا) کی بنیاد بنتا ہے۔

چوتھا کلیہ چونکہ ابن عباسؓ کی روایت "الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھو لاولیٰ رجل ذکر" (یعنی سب سے پہلے نصوص کے مقرر کردہ حصے ان کے حقداروں کو ادا کرو، پھر جو باقی بچے وہ سب سے زیادہ قریبی مرد کا حق ہے) درجۂ اول کے قریب ترین مرد کو مرتبۂ عصوبت[1] دیتی ہے، لہٰذا کلیہ یہ ہے کہ جب

[1] جب کوئی مرد عصوبت کا مرتبہ پاتا ہے تو اس کی بہن ضمناً اس مرتبے میں اس کی شریک بنتی ہے۔ (باقی صفحہ ۲۱ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک درجۂ اوّل کا کوئی فرد بھی عصوبت کا مقام لینے کو موجود ہو، اس مقام کو اُس سے بعد کے درجے کا کوئی وارث نہیں لے سکتا۔ مرتبۂ عصوبت میں بلاواسطہ اقربا اور بالواسطہ اقربا کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ نہ صرف یہ کہ اس معاملے میں حدیث بالکل قطعی اور متفق علیہ ہے، بلکہ قرآن کی آیات میں بھی اس کے خلاف دلیل بننے والی کوئی جزئی سے جزئی صورت اخذ نہیں کی جا سکتی۔ پس یہ کلیہ ایسے کلیوں میں سے ہے جن کا ترک خود شریعت اسلامیہ کو، قرآن وسنّت کو الوداع کہنے کے ہم معنی ہے۔ واضح رہے کہ یہ کلیہ جو اوپر کے کلیوں کا فطری تقاضا بھی ہے چچاؤں کی زندگی میں یتیم پوتوں کے وارث ہونے میں مانع ہے۔

پانچواں کلیہ | پانچواں کلیہ جو بروئے نصوص صدفی صد قطعی ہے، یہ ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کی زندگی میں اس کا وارث نہیں ہو سکتا۔ وارث کوئی بنتا ہی اس وقت ہے جب کوئی شخص موت کی سرحد سے گذر جائے اور مال چھوڑے۔

نصوص قرآنی میں جہاں قانون وراثت بیان ہوا ہے وہاں ہر ہر ٹکڑے میں مما ترک، مما ترکن، مما ترکتم، کے الفاظ بار بار وارد ہیں یعنی قانون وراثت کی بحث کا موضوع ہی "ترکہ" ہے۔ نہ کوئی مال کسی شخص کی زندگی میں ترکہ ہو سکتا ہے، نہ اس مال میں بہ حیثیت وارث کسی کا حق پیدا ہوتا ہے۔

پھر ملاحظہ ہو سورۂ نساء رکوع ۲۴ کی آیت یستفتونک . . . الخ میں آتا ہے "ان امرؤ ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت . . ." (اگر کوئی شخص مرگیا، اور اس کی کوئی اولاد نہیں ہے بلکہ اس کی بہن موجود ہے تو . . .) یہاں پوری وضاحت ہے اس بات کی کہ ورثا تلاش کرنے کا سوال، یا اقربا کے استحقاقِ وراثت کا سوال کسی شخص کے مرنے پر پیدا ہوتا ہے، زندگی میں نہیں۔

چنانچہ یہ اصول بھی قطعی اصول ہے کہ کسی کی زندگی میں کوئی دوسرا اس کا وارث قرار نہیں پاسکتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۶) یہ قاعدہ قرآن کے صریح منصوص احکام پر مبنی ہے۔ میت کی اولاد ذکور نہ ہونے کی صورت میں اس کی بیٹیوں کے ساتھ بہن کا عصبہ ہونا ایک استثنائی صورت ہے جو حدیث پر مبنی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ اس کے مرنے کے بعد وراثت کا حق پیدا ہوتا ہے[1]۔

واضح رہے کہ یہ متفق علیہ اور قطعی اصول بھی یتیم پوتے کے مسئلے پر پوری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اُس کا باپ اپنے باپ کی زندگی میں وارث نہیں تھا، لہٰذا اُس کا کوئی حق ثابت نہیں۔

چھٹا کلیہ

اوپر کے کلیے کے منطقی نتیجے کے طور پر دوسرا کلیہ یہ نکلتا ہے کہ کسی ذی مرنے والے کے ترکہ میں حقِ وراثت صرف زندہ وارثوں کا ہوتا ہے، مر جانے والے ممکن ورثا کو سرے سے محسوب ہی نہیں کیا جاتا۔

یہ کلیہ بھی نصوصِ قرآنی کی قطعی دلالت پر مبنی ہے۔ آپ خود غور کیجیے کہ قانونِ میراث کو بیان کرنے والی آیات (نیز احادیث) میں جہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ للرجال نصیبٌ، تو ان موقعوں پر کیا مردوں اور عورتوں سے مراد زندہ مرد اور زندہ عورتیں ہیں یا زندہ کے ساتھ مردہ بھی؟ اسی طرح "یوصیکم اللہ فی اولادکم" میں بات زندہ اولاد کی ہے یا زندہ و مردہ دونوں کی؟ پھر اسی طرح "فان کن نساءً فوق اثنتین" میں بیان زندہ عورتوں کا ہے یا زندہ و مردہ دونوں کا؟ اسی طرح "وان کانت واحدۃً"، "ان کان لہ ولدٌ"، "فان لم یکن لہ ولدٌ"، "فان کان لہ اخوۃٌ"، "ان لم یکن لھن ولدٌ"، "ان لم یکن لکم ولدٌ"، "فان کان لکم ولدٌ"، "ولہ اخٌ او اختٌ"، "فان کانوا اکثر من ذالک"، "لیس لہ ولدٌ ولہ اختٌ"، "ان لم یکن لھا ولدٌ"، "فان کانتا اثنتین"، "وان کانوا اخوۃ رجالاً ونساءً" کے تمام ٹکڑوں کو سامنے رکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ "اگر فلاں رشتہ دار ہو" سے کیا یہ مدعا نکالا جا سکتا ہے کہ کبھی پہلے موجود رہا ہو، یا "فلاں رشتہ دار نہ ہو" سے یہ مفہوم بھی پیدا کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کا رشتہ دار سرے سے پیدا ہی نہ ہوا ہو اور کبھی پہلے بھی وجود نہ رکھتا ہو؟ اگر کوئی شخص کہے کہ ہاں، یہ مفہوم بھی نکالا جا سکتا ہے تو سب سے پہلے تو ہم اسے عربی زبان و ادب کا لحاظ کرنے پر توجہ دلائیں گے، پھر اسے یہ بتائیں گے کہ آج تک کوئی ایک فرد بھی دورِ نبویؐ سے اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اس انوکھے اجتہادی مفہوم کی گنجائش کہیں سے ڈھونڈ نکالی ہو۔ لیکن اس پر بھی اگر نئے اجتہاد نہ آئے تو ہم ذیل

---

[1] برطانوی قانونِ وراثت میں بھی یہ اصول اسی طرح زیرِ عمل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی نصوص سامنے رکھ کر پوچھیں گے کہ ان پر کس طرح آپ کا مفہوم منطبق ہو سکے گا:۔

(۱) وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَۃً اَوِ امْرَاَۃٌ وَّلَہٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ (ترجمہ: اگر کوئی مرد یا عورت اس حالت میں ترکہ چھوڑے کہ وہ کلالہ ہو یعنی نہ اس کا باپ زندہ ہو، نہ بیٹا بلکہ اس کے بھائی یا بہن ہوں تو۔) میں کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ مرے سے کوئی شخص عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بے باپ کے پیدا ہوا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ باپ تھا اور مر گیا، لہٰذا اس کے وارث ہونے کا سوال خارج از بحث ہو گیا۔

(۲) وان لم یکن لہ ولد وورثہ ابواہ فلامہ الثلث (یعنی اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے وارث اس کے والدین ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ⅓ ہوگا) میں کیا والدین مردہ ہونے کی صورت میں بھی وارث ہوں گے؟ اور ⅓ حصہ اس کی ماں کا شمار کیا جائے گا؟

(۳) حدیث: الخال وارث من لا وارث لہ (ماموں وارث ہے اس کا جس کا کوئی وارث نہ ہو) میں کیا من لا وارث لہ سے مراد یہ ہے کہ جس کا کوئی زندہ یا مردہ وارث موجود نہ ہو اس کا وارث ماموں ہوگا یا بات صرف زندہ وارث تک محدود ہے۔ اور زندہ وارث ہی کے نہ ہونے کی وجہ سے ماموں کو حق مل رہا ہے نیز کیا خود خال سے مراد ایسا خال بھی لیا جا سکتا ہے جو میت کی وفات سے پہلے مر گیا ہو؟

(۴) حدیث:۔ بروایت ابن بریدہ، عن ابیہ، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعل للجدۃ السدس اذا لم یکن دونھا ام (یعنی نبی صلعم نے دادی کے لیے چھٹا حصہ مقرر کیا ہے جبکہ اس کے ساتھ ماں موجود نہ ہو) میں کیا اذا لم یکن دونھا ام سے مراد یہ لیا جا سکتا ہے کہ میت کی سرے سے ماں ہے ہی نہیں، یا صاف صاف مطلب یہ لیا جائے گا کہ ماں تو ہونی ہی چاہیے لیکن وہ اس سے پہلے مر چکی ہو۔

پس اس معاملے میں پوری امت متفق ہے کہ وراثت کے حق کی بحث کا تعلق صرف اُن زندہ ورثا سے ہے جو کسی مورث کے مرنے پر موجود ہوں۔ پہلے کے مرے ہوؤں کا کسی طرح کا استحقاق سرے سے شریعت اسلامی کے نظامِ قانون میں نہیں پایا جاتا۔ اس طرح کے غیر عقلی استحقاق کی مثال اگر ہے تو ہندوانہ رواجی قانون میں ہے[1]۔ اب اگر کسی کو یہ ہندوانہ رواجی قانون پسند ہو تو سرے سے شریعت کو چھوڑ کر اسے اختیار کر سکتا ہے، لیکن اس ہندوانہ رواجی قانون کے اجزا کو لا کر شریعت کے قانون میں پیوند نہیں دے سکتا۔

واضح رہے کہ یہ کلیہ بھی یتیم پوتے کے زیرِ بحث مسئلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسے توڑے بغیر

[1] یہ صورت فرانسیسی قانون میں بھی پائی جاتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم کسی طرح اُسے وارث نہیں بنا سکتے :-

صورتِ مسئلہ | جن کلیوں کو ہم نے ایک ترتیب کے ساتھ مختصر سا استدلال کر کے پیش کیا ہے وہ کلیے کتاب و سنّت کے نصوص پر مبنی ہیں۔ ان کلیوں ہی کا عمل ہے جو یتیم پوتے کو زندہ چچاؤں کے ساتھ حقِ وراثت دلوانے میں مانع ہے۔ فرض کیجیے کہ زید کے تین بیٹے اسلم، اکرم، اور اکبر تھے۔ اسلم زید کی زندگی میں اس کے ترکے کی تقسیم سے قبل فوت ہو گیا۔ اب زید کے دو بیٹے اسلم اور اکرم موجود ہیں، اور ان کے ساتھ اسلم کے بیٹے و، ب، ج، اکرم کے بیٹے د، ہ، س، اور اکبر

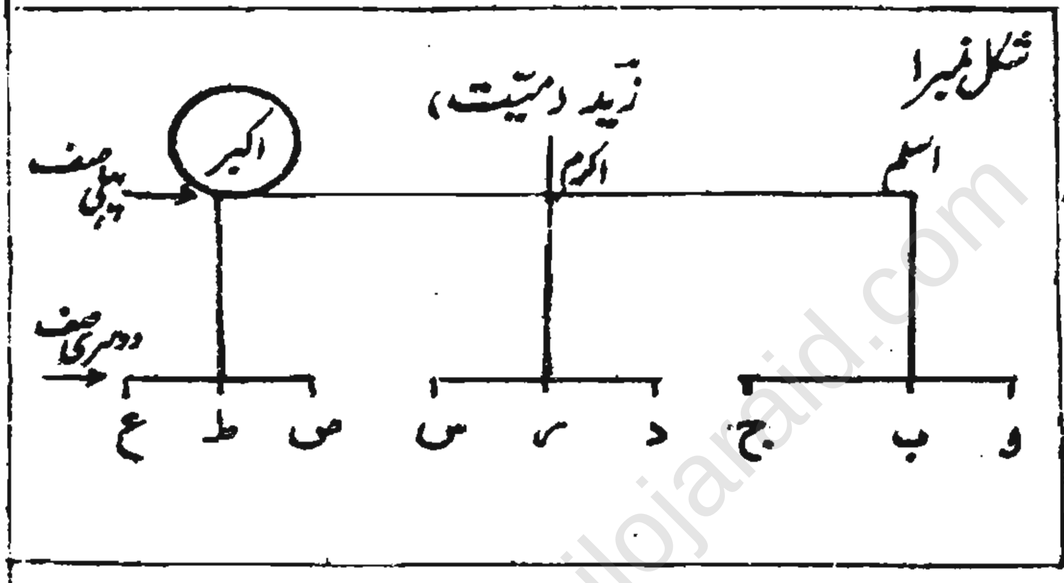

کے بیٹے ص، ط، ع بھی ہمارے سامنے ہیں۔

زید کی موت پر جب ہم مستحقینِ میراث کی تلاش میں نکلتے ہیں تو آگے پیچھے دو صفیں ہمارے سامنے آتی ہیں، پہلی صف زید کے بیٹوں اسلم اور اکرم کی ہے، اور دوسری صف زید کے پوتوں و، ب، ج، د، ہ، س، ص، ط، ع کی ہے۔ ہمارے قانونِ میراث کے ثابت شدہ اور نہایت درجہ معقول کلیات اور عام اصولوں کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک پہلی صف میں مرتبۂ عصوبت رکھنے والا (رجل ذکر) رکھنے والا ایک وارث بھی موجود ہو، دوسری صف کا کوئی فرد ترکہ نہیں پا سکے گا۔ کیونکہ اسلم اور اکرم کا تعلق زید سے بلاواسطہ ہے، لیکن و تا ع کی صفِ دوم کے جملہ افراد کا تعلق بالواسطہ ہے۔

آپ کا جذبۂ رحم | لیکن آپ کے ذہن میں صرف پوتے کا تصوّر کارفرما نہیں، بلکہ منکرینِ حدیث نے اُس کے ساتھ اسم صفت "یتیم" لگا کر مسئلے کو بڑی جذباتی شکل دے دی ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اوّل تو تقسیمِ وراثت کے مجموعی واقعات میں پوتے کا ایسا مسئلہ کے فیصد صورتوں میں پیدا ہوتا ہوگا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر کتنی صورتوں میں پوتا بالغ اور صاحب اولاد ہوگا اور اپنا کاروبار، اپنی املاک اور اپنے والد سے بلا ہُوا ترکہ رکھتا ہوگا۔ اور یہ بھی کوئی نہیں سوچتا کہ کتنی صورتوں میں دادا مرتے ہوئے جائداد کے بجائے ذمہ داریاں (LIABILITIES) چھوڑ کر رخصت ہوگا لیکن موجودہ پروپگنڈے کی جھم آپ کے ذہن میں انگوٹھا چوستا ہُوا ایک ننھا سا یتیم لا کھڑا کرتی ہے۔ آپ کو اس پر رحم آتا ہے، آپ کے جذبات رقت اُمڈتے ہیں، اور آپ سوچتے ہیں کہ خدا کا قانون کبھی ایسا بے مہر نہیں ہو سکتا کہ یتیموں کو یوں بے کسی کی حالت میں ڈال دے، جبکہ شریعت میں یتیموں کو سہارا بہم پہنچانے کے لیے خود خدا اور رسول نے جگہ جگہ تاکید کی ہے۔ یہاں تک کہ مسدس حالی کا ایک مشہور بند "وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" آپ کی زبان پر آجاتا ہے۔ پھر آپ کو خیال آتا ہے کہ ہو نہ ہو خدا کے قانون کو سمجھنے میں غلطی کی گئی ہے، یا واقعی من گھڑت روایات کو قانونِ الٰہی کے ساتھ گڈمڈ کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ہمارے نظامِ فقہ و قانون میں ایسے ایسے مضحکہ انگیز مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

مگر جب آپ ذرا تأمل سے کام لے کر سوچیں گے اور اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ کے عین قرآنی اصول کا عمل، نیز حجبِ حرمان کا اثر مختلف صورتوں میں ملاحظہ فرمائیں گے تو رحم کے بے شمار مواقع سامنے آئیں گے۔ یہاں تک کہ اگر حدیث و سنت سے آپ قطعی انکار کر کے منکرینِ حدیث کا "خالص قرآنی نظامِ قانون" بھی اپنا لیں تو بھی اس طرح کی "قابلِ رحم" اور "مضحکہ انگیز" صورتوں سے نجات نہیں۔ مثلاً ایک شخص کے ممکن ورثاء میں اگر بیٹیا ــــ اور بیٹا ہی نہیں، پوتا، پڑپوتا ــــ موجود ہو تو اس کی سگی بہن اپنے قریبی تعلق کے باوجود محروم رہے گی، پھر اگر وہ بیوہ بھی ہو تو آپ کہیں گے کہ "آہ! بیوہ بہن محروم؟ ــــ خدا کا قانون ایسا بے مہر نہیں ہو سکتا، درآنحالیکہ بیواؤں کو سہارا بہم پہنچانے کی تاکید کی گئی ہے۔" اسی طرح نواسی (جس کی والدہ اپنے والد کے ترکہ کی تقسیم سے قبل فوت ہوگئی ہو) بھی قابلِ رحم ہے۔[1] پھر یتیم بھانجوں بھانجیوں اور بھتیجوں بھتیجیوں کی محرومی بھی جذباتِ ہمدردی میں ہل چل پیدا کر سکتی ہے۔ نیز آپ یوں

[1] علاوہ بریں نکاح و طلاق، رضاعت و کفالت اور مضاربت و مشارکت وغیرہ کے قوانین میں (بلکہ دنیا کے ہر قانونی نظام کے ہر شعبے میں) بے شمار مواقعِ رحم پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب اگر قانون کو جذبات کا کھلونا بنایا جانے لگے تو سوچیے کہ کوئی قانون بھی چل سکتا ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی سوچ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں کوئی یتیم یا بیوہ یا بے کس آپ کو نظر آئے، آپ تقاضا کریں کہ قانونِ شرعی میں اسے بھی کسی نہ کسی کا وارث بنا دیا جانا چاہیے۔

اب اگر آپ کے جذبۂ رحم کی ہر لہر کو اس کا کھلا موقع دے دیا جائے کہ وہ کلیات اور فارمولوں اور نظامِ فقہ و قانون کے پورے ڈھانچے کو توڑتی پھوڑتی جدھر سے جدھر چاہے بڑھتی جائے تو خیال فرمائیے کہ ایک جزئی پیچیدگی کو حل کرنے کے لیے آپ کُل کو تباہ کر ڈالیں گے۔

اجماع آپ کے جذبۂ رحم کے تقاضے کے جواب میں علماء آپ سے یہ کہتے ہیں کہ یتیم پوتے کو اس کے چچاؤں کی موجودگی میں ترکہ میں سے حصّہ نہ دینے پر "اجماع" ہے۔ اِس سے اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی قانونِ وراثت جن کلیات اور فارمولوں سے بنایا گیا ہے اور جن کے قائم رہتے ہوئے یتیم پوتے کو حصہ دلوانے کا کوئی راستہ نہیں، وہ کلیات اور فارمولے ایسے ہیں کہ بالکل متفق علیہ ہیں اور انہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی حکومتوں کے نظامِ عدلیہ نے ابتداءً تا آخر یتیم پوتے کو اس کے چچاؤں کے پہلو بہ پہلو کبھی وارث تسلیم نہیں کیا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ یتیم پوتے کی وراثت کا یہ زیرِ بحث مسئلہ کسی خاص دَور یا ملک کے حالات میں اپنی نوعیت تبدیل نہیں کرتا اور نہ حالات کے اختلاف سے متاثر ہوتا ہے، لہٰذا یہ کوئی اجتہاد کرنے کا میدان نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ پہلے ایک اجتہاد کیا گیا تھا جو نئے حالات میں اپنے اندر تبدیلی چاہتا ہے لہٰذا ہم از سرِ نو اجتہاد کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ قانونِ وراثت کے بیشتر مسائل کی طرح ایک ٹھوس اور مستقل مسئلہ ہے۔ اس لیے اس میں تبدیلی کرنے کے لیے علماء کے دعوے کو توڑنا صرف اس طرح ممکن ہے کہ آپ یہ ثابت کر دیں کہ اس مسئلے کو موجودہ شکل دینے والے کلیات اور فارمولے ہی غیر اسلامی یا نامعقول ہیں[1]

---

[1] منکرینِ حدیث کی طرف سے یہ حملہ (ATTEMPT) کیا تو کیا ہے مگر اس حد تک نہیں کہ وہ مذکورۂ بالا کلیات کا کامل رد کر دیں، ان کو تسلیم کرنے پر وہ بھی مجبور ہیں بس وہ چند تفصیلی جزئی مثالوں میں جا کر یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ خود فقہا نے ان میں سے ہر کلیّہ کی خلاف ورزیاں کی ہیں اور ان "خلاف ورزیوں" کو بیان کرتے ہوئے وہ کبھی اشعار چسپاں کر کے اور کبھی طنز کر کے ان کا مضحکہ بھی اڑاتے ہیں۔ لیکن ایسے بایک مواقع پہ پوزیشن درحقیقت یہ ہوتی ہے کہ ایک مسئلہ میں بہ یک وقت دو یا تین کلیوں کا

(باقی ص ۲۱۳ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا ان کی بنیاد نصوص کے تقاضوں اور اشارات پر نہیں ہے یا اُن پر درحقیقت اجماع ہی نہیں ہے بلکہ وہ اختلافی اور قابلِ بحث و نظر ہیں۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ نصوص، آنحضور صلعم کے فیصلوں، اسلامی مجالسِ شوریٰ اور اسلامی عدلیہ کے فیصلوں میں سے آپ کوئی نظیر ایسی ڈھونڈ کے لے آئیں جس سے یتیم پوتے کو اس کے چچاؤں کی موجودگی میں وراثت دلوانا ثابت ہو سکے۔ اس صورت میں اگر ہمارے قانونِ میراث کا ڈھانچہ شکست و ریخت سے دوچار ہوتا ہو تو یہ آپ کا کام ہے کہ اس ڈھانچے کو نئے کلیات اور دفعات/اصولوں سے از سرِ نو ترتیب دیں۔ لیکن اس معقول اور سائنٹفک روش (APPROACH) کے بجائے اگر آپ صرف جذبۂ رحم کا مظاہرہ کرتے پھریں اور لوگوں سے کہیں کہ "دیکھو جی، یتیم پوتا محروم ہے؛ یہ ملاؤں کی سازش ہے، یہ روایات کا فتنہ ہے، مکھی پر مکھی ماری جا رہی ہے" — تو ایسے مذاق اور ایسی شاعری سے قانون کے مسائل تو حل نہیں ہو سکتے۔

ایک چیز جسے رسول اللہ صلعم کے دور سے لے کر خلفائے راشدین، اور مابعد کے تمام ادوار میں

(بقیہ حاشیہ ۳۴۲)

عمل جمع ہو جاتا ہے اور سوچنا یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ پر کس کلیے کا عائد کرنا اہم تر ہے اور کس کو کم اہمیت کی وجہ سے چھوڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر اختلاف بھی ناگزیر ہو جاتا ہے اور اس طرز کے پیچیدہ مسائل میں ہمارے مدارسِ فقہ کا پہلے سے اختلاف موجود ہے اور آئندہ بھی موجود رہے گا۔ مگر نہ پہلے تفاصیل کے فنی اشکالات اور ان پر پیدا ہونے والے اختلاف کی وجہ سے کسی نے ان کلیات کی صحت یا اہمیت سے انکار کیا ہے، نہ آج ایسا کرنا صحیح ہے۔ دنیا کے ہر نظامِ قانون میں، بلکہ ہر شعبۂ زندگی کے علوم و فنون میں کلیات کو باریک تفصیلی و جزئی امور میں منطبق کرتے ہوئے یہی صورت پیش آتی ہے۔ لیکن کبھی بھی اہلِ علم بنیادی مسلمات کو جزئی اشکالات کی بنا پر مضحکہ انگیز نہیں قرار دیتے۔ لیکن یہ ہمارے منکرینِ حدیث خوب لوگ ہیں یہ ہمارے علمائے قانون کی کتابوں میں سے چھانٹ چھانٹ کر وہ حصے نکال لاتے ہیں جن میں اعتراضات اور اشکالات زورِ بیان کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ وہ اعتراضات کے جو جواب دیتے ہیں، اور اشکالات کو جس طرح حل کرتے ہیں، ان حصوں کا یا تو بلیک آؤٹ کر دیا جاتا ہے یا ان کو حد درجہ کمزور کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح فقہ اور حدیث کے خلاف انتشار بھی پیدا کرنے میں کامیابی ہوتی ہے اور علمیت و تفکر کی دھونس بھی قائم ہو جاتی ہے۔

© rasailojaraid.com

ارباب حل وعقد، مجالس شوریٰ، عدالتوں اور تحقیقی وعلمی اداروں اور فقہ کے مدارس فکر نے ایک خاص طرح نصوص کی تعبیر کرتے ہوئے سختی سے ملحوظ رکھا ہے اور تمام اختلافات کے درمیان جس پر اتفاق قائم رہا ہے اسے ہمارے نظام فقہ و قانون میں نصوص کے بعد ایک شرعی حجت کی حیثیت حاصل ہے۔ ایسی شرعی حجت کو توڑنے کے لیے محض ایک اندھا جذبہ اور ایک سرسری طرز فکر اور بازاری استہزاء و طنز تو کافی نہیں اجماع کو اس طرح سے اگر کھیل بنا لیا جائے تو ایک قانونِ میراث ہی کے نہیں، تمام شعبوں کے قانونوں کے بخیے ادھڑ جائیں گے۔ آپ کے مطالبے کے مطابق یتیم پوتے کو وارث بنانا تو کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن اس سے قانون کا سارا محل گر پڑتا ہے، اُسے بچانا ضرور مشکل ہے۔

اجماع سے قطع نظر کرکے مسئلہ کو حل کرنے کی پانچ صورتیں

ہم اپنی بات کو سمجھانے کے لیے تفصیل سے ان صورتوں کا تجزیہ کرتے ہیں جن کے ذریعے یتیم پوتے کو حصہ دلوائے جانے کے لیے بحث و تمحیص ہو رہی ہے۔

صورتِ اول ——— یہ ہے کہ ہم شریعت کے قانونِ میراث میں تقدم و تأخر کا پورا سسٹم ہی ختم کردیں اور "الاقرب فالاقرب" کے کلیے پر خط نسخ پھیر دیں۔ اب یتیم پوتا بڑی آسانی سے بیٹوں کے ساتھ وارث قرار پا جائے گا۔ لیکن ہمارے اس اجتہادی اقدام کا اثر سارے ہی نظامِ قانون کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا، یعنی اب ایک میت کے مرنے پر اس کے تمام کے تمام زندہ رشتہ دار بیک دم وارث ہونگے چاہے کسی کا درجۂ قرابت کتنا مقدم ہو، اور کسی کا کتنا مؤخر۔ اور اس صورت کے اختیار کرنے سے اجماع تو کجا، خود نصوص پر پانی پھر جائے گا۔

صورتِ دوم ——— یہ ہے کہ "یوصیکم اللہ فی اولادکم" میں سے لفظ اولاد کو لے کر ہم اس کے تحت بیٹوں اور پوتوں اور پڑپوتوں، نیز بیٹیوں، نواسیوں اور پڑنواسیوں سب کو جمع کردیں۔ اور آگے پیچھے کی صفیں توڑ کر ساری اولاد کو ایک صف میں لا کھڑا کریں۔ اس اجتہاد کے ذریعے بھی پوتا کسی میت کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے وارث بن جائے گا۔ یعنی مثال ۲ مذکورۂ بالا میں اسلم اور اکرم کے ساتھ ا، ب، ج، د، ہ، س، ص، ط، ع مل کر کل ۱۱ افراد برابر سرابر کے وارث ہونگے اور ہر ایک کو ۱/۱۱ ترکہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتہادی تجویز بھی نصوص پر ہاتھ صاف کر دیتی ہے۔ کیونکہ الاقرب فالاقرب کا کلیہ

© rasailojaraid.com

اولاد میں داخلی طور پر بھی فرقِ مراتب پیدا کرتا ہے۔

صورتِ سوم ——— یہ ہے کہ ہم منکرینِ حدیث کے نظریۂ قائم مقامی کو اختیار کر لیں لیکن پہلے اس نظریے کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فقہائے متقدمین نے خود قائم مقامی کا نظریہ اختیار کیا ہے۔ یعنی جو تعلق بالواسطہ ہونے کی وجہ سے مرتبۂ ثانی پر ہوتا ہے وہ واسطہ کے بیچ میں سے ہٹ جانے پر مرتبۂ اول پر آجاتا ہے۔ جیسے ابوبکر ابن عباس کے قول "الجدّ اب" (دادا بمنزلہ باپ کے ہے) کے تحت باپ کو ملنے والی میراث دادا کے حصے میں جاتی ہے۔ اگر باپ کی خالی جگہ کو دادا پُر کر سکتا ہے تو بیٹے کی خالی جگہ کو پوتا کیوں نہیں پُر کر سکتا[1]۔ دونوں صورتیں ایک دوسرے کا عکس ہیں تو جو فارمولا ایک طرف چلتا ہے وہی دوسری طرف چلنا چاہیے۔ بڑا معقول استدلال ہے اور بڑا منصفانہ تقاضا ہے، مگر یہ جن مغالطوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے اُن کا تجزیہ کیے بغیر ہم کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اصول اور فروع میں یہ مسئلہ یکساں نہیں بیٹھتا، بلکہ دونوں طرف بڑا فرق ہے۔ فرق یہ ہے کہ اصول میں ذکور (MALES) کی اقرب ترین صف کے اندر باپ ہمیشہ صرف ایک ہی پایا جاتا ہے، کسی کے دو یا چار، یا چھ باپ نہیں ہوتے، اسی طرح اس کے بعد کی صف میں دادا بھی صرف ایک ہی پایا جاتا ہے، پانچ، سات، دس بیس نہیں ہوتے (ہم باپ کے چچاؤں کو درکنار رکھتے ہیں) چنانچہ وہاں مسئلہ یہ نہیں پیدا ہوتا کہ دو تین باپوں میں سے اگر ایک مر گیا ہو اور اس کا باپ (یعنی میت کا دادا) باقی ہو تو میت کے باپوں کے ساتھ اُس دادے کو بھی وارث بنایا جائے یا نہیں۔

---

[1] دیکھا آپ نے، قانون کا مزاج ہی کلیات پسند ہے۔ جہاں ایک جزئی نظیر سامنے آئی تو ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس سے کلیہ بنے اور وہ سارے قانون پر چھا جائے۔ آپ اگر پوتے کو بیٹوں کے ساتھ وارث قرار دینے کی نظیر ایک مرتبہ قائم کر دیں تو لازماً یہ نظیر ایک یا چند کلیات کو جنم دے گی جن کی فطرت سارے قانون پر چھا جانے کے لیے زور کرے گی۔ پھر اگر یہ نئے کلیات سابق کلیات سے متضاد ہوئے تو پورے ڈھانچے کو تہ و بالا کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قانون میں کوئی نئی اجتہادی نظیر قائم کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

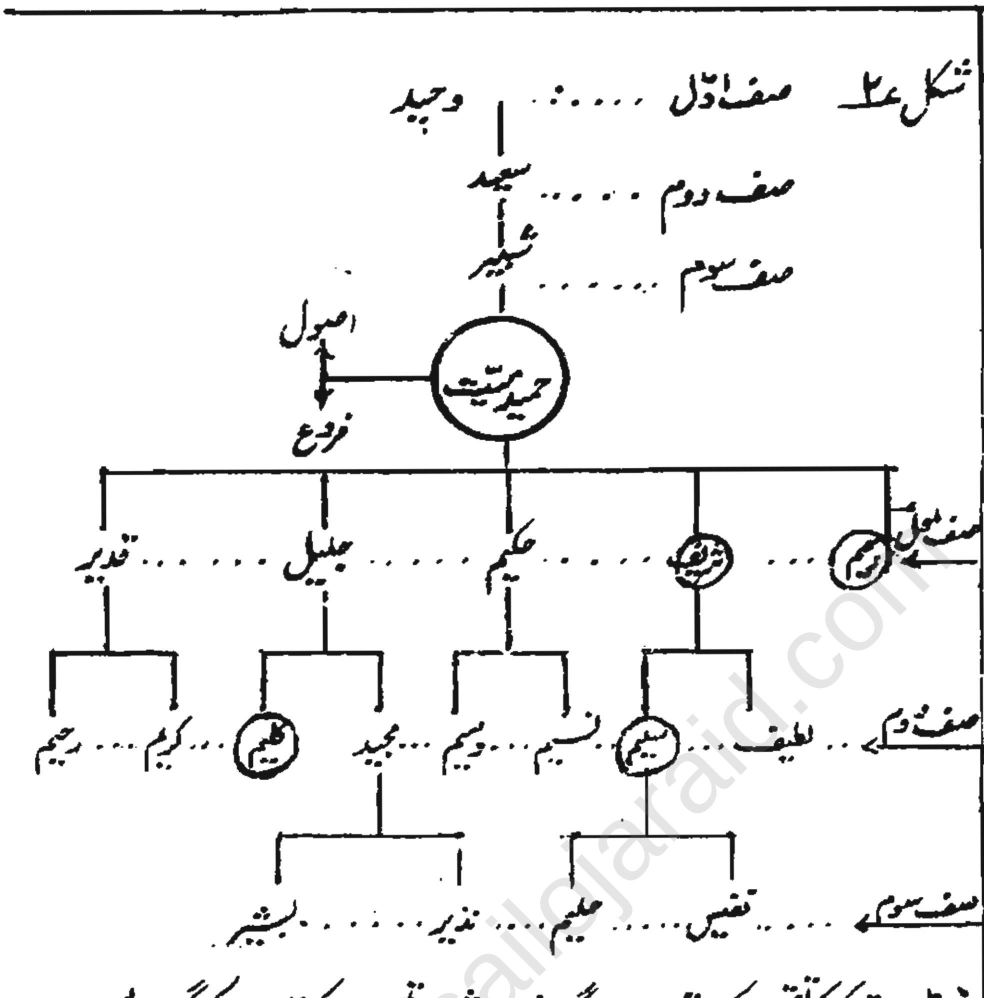

نوٹ: ترکہ کی تقسیم کے وقت جو لوگ فوت شدہ تھے ان کے ناموں کے گرد دائرہ ہے۔

بخلاف اس کے فروع کی اقرب ترین صف میں بیٹے بھی کئی پائے جا سکتے ہیں، جن میں سے کچھ مر گئے ہوں کچھ زندہ ہوں، اور بعد کی صف میں پوتے بھی کثیر التعداد ہو سکتے ہیں، اور پھر اسی طرح پڑپوتے وغیرہ بھی بے شمار ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مسئلے کی یہ نوعیت صرف فروع ہی میں پیدا ہوتی ہے کہ میت کے صف اوّل کے اقربا (بیٹوں)، کے ہوتے ہوئے اس کے صف دوم کے ورثا (یعنی پوتوں) کو، خصوصاً جبکہ وہ یتیم ہوں بہ یک دم ترکہ میں سے حصہ ملنا چاہیے یا نہیں؟

شکل ۲ میں اصول اور فروع کے دونوں دائروں میں مسئلہ کی نوعیت کا فرق واضح ہو سکتا ہے۔ اصول کی تین صفیں (اور ان سے اوپر جو بھی ہوں) ایک ہی فرد پر مشتمل ہیں، لیکن فروع میں صفِ اوّل میں ۵، صف دوم میں ۸، صف سوم میں ۴ وارث موجود ہیں۔ چنانچہ میت کے باپ کی عدم موجودگی میں دادا اس وجہ سے وارث قرار پاتا ہے کہ صف اوّل (جس میں باپ تھا) میں کوئی ایک فرد بھی باقی نہیں، وہ بالکل خالی ہو گئی ہے، ورنہ اگر باپ کثیر التعداد ہوتے اور چند کے مرنے کے بعد چند باقی رہتے تو دادا کو کچھ نہ ملتا۔ ٹھیک اسی اصول پر فروع میں جب کسی میت کے اقربا کی صف اول بالکل خالی ہو جائے تو پیچھے کی پوری صف (نہ کہ اس صف کا کوئی حصہ) اٹھ کر مرتبۂ اول پر آ جاتی ہے۔ لیکن جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک صفِ اوّل میں ایک متنفس بھی موجود ہوگا وہ صفِ دوم کے لیے حاجب ہوگا۔ ملاحظہ فرمایئے شکل

۳۲۔ حمید کے پسماندہ اقربا کی تین صفوں میں ۱۳ افراد موجود ہیں۔ اس کا ترکہ لینے کے لیے جب تک صفِ اول کا ایک فرد بھی موجود ہے صفِ دوم اور صفِ سوم زیرِ بحث ہی نہیں آئے گی۔

شکل ۳۲

حمید (میت)

صفِ اول:۔ (رحیم) ... (شریف) ... حکیم ... جمیل ... قدیر

صفِ دوم:۔ لطیف ... (سلیم) ... نسیم ... وسیم ... مجید ... (حلیم) ... کریم ... رحیم

صفِ سوم:۔ نفیس ... علیم ... نذیر ... بشیر

نوٹ:۔ ترکہ کی تقسیم کے وقت جو لوگ فوت شدہ تھے ان کے ناموں کے گرد دائرہ ہے۔

"قائم مقام" (وارث) دراصل نیچے کی طرف سے نہیں تحقیق کیے جانے کہ نفیس اور حلیم کس کے قائم مقام یا وارث ہیں، بلکہ اوپر کی طرف سے دیکھا یہ جانا ہے کہ حمید (میّت) کے قائم مقام یا وارث اوّلین مرتبہ پر کون لوگ ہیں۔

گویا باپ اور دادا والی صورت بیٹوں اور پوتوں والی صورت پر منطبق نہیں ہوتی کہ اُس سے قیاس کر کے یہاں کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔ لیکن کہا جاسکتا ہے کہ فقہائے متقدمین نے خود "ابن الابن" کو بھی تو "ابن" قرار دیا ہے، لہٰذا (شکل ۱ کے مطابق) اکبر کے مرجانے کی صورت میں زید کے پوتوں ص، ط اور ع کو اگر اکبر کے مقام پر رکھا جائے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اچھا فرض کر لیجیے کہ ہم اس اجتہاد کو مان لیتے ہیں۔ اب ہوگا یہ کہ اسلم، اکرم، ص، ط اور ع میں زید کا ترکہ بالکل یکساں تقسیم ہوگا کیونکہ ہم نے اپنے سمجھے ہوئے فارمولے کے مطابق اکبر کا درجہ اس کے بچوں کو دیا ہے، یا بالفاظِ دیگر ان کو صفِ سوم سے اٹھا کر صفِ اول میں لا کھڑا کیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر اس تقسیم کے بعد اکرم یا اسلم مرجائے تو ان کے بیٹوں کا حصہ اکبر کے بیٹوں سے بہت کم رہے گا، نیز اسلم اور اکرم کی بیوائیں تو ان کے ترکہ میں سے کچھ پالیں گی، لیکن اکبر کی بیوہ کو کچھ نہ ملے گا۔ خیر، ان اثرات کو الگ رکھتے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصولی حیثیت سے غور کیجیے۔ ہم یہ کلیہ پہلے سوچ سمجھ کر طے کر آئے ہیں کہ بروئے حدیث "اولیٰ رجل ذکر" جب تک مرتبۂ عصوبت پر موجود ہو تو اس سے درجہ میں نیچے کے جتنے ممکن وارث بھی ہوں، وہ کچھ نہیں پاسکتے۔ تو ہمارے "قائم مقامی" کے نظریے کا عمل اس کلیے کو ختم کرتا ہوا خود حدیث صریح کو پامال کر دیگا۔ زید کے وارثوں میں ذوی الفروض کوئی بھی نہیں کہ جس کا حصہ اٹل مقدار میں متعین ہو، بلکہ اس کے وارث عصبات کی نوعیت کے ہیں۔ ان عصبات میں مرتبۂ اول پر دو بیٹے ہیں، مرتبۂ ثانی پر ۹ پوتے۔ اب جب تک مرتبۂ اول پر بیٹے موجود ہیں، پوتے کچھ نہیں پا سکتے، چاہے وہ یتیم ہوں، لُولے لنگڑے ہوں، یا کسی اور مصیبت میں مبتلا ہوں۔

صورت چہارم ——— یہ ہے کہ منکرین حدیث کے نظریۂ قائم مقامی کا وہ دوسرا تصور اختیار کیا جائے جو ہندو رواجی قانون سے ماخوذ ہے، اور جو اخباری بحثوں میں زیادہ تر پیش کیا جا رہا ہے، نیز جس پر خود چیمہ صاحب کا ترمیمی مسودۂ قانون مبنی ہے۔

وہ تصور یہ ہے کہ یتیم پوتا اگرچہ بذات خود وارث نہیں، لیکن وہ اپنے باپ کا حصہ دادا سے لینے کا حق دار ہے۔ یعنی اس تصور کو قبول کرنے کے لیے ہمیں شریعت اسلامیہ کا یہ بنیادی کلیہ ختم کرنا ہوگا کہ کسی شخص کی زندگی میں اس کے مال پر کسی کا حق میراث عائد نہیں ہوتا اور اس کلیے کو بھی ختم کرنا ہوگا کہ تقسیم ترکہ کے وقت زندہ ورثاء کے ساتھ کسی مردہ وارث کو مستحق بنا کے کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ اور ان دو کلیوں سے آزاد ہو کر جب ہم قانون سازی کریں گے تو ایک یتیم پوتے کے لیے ہی مردہ باپ کا حصہ زندہ نہیں رکھنا ہوگا بلکہ کسی مردہ وارث کے جو بھی ممکن حقدار مثلاً بیوی، ماں، بہن، بھائی وغیرہ موجود ہوں، وہ سب حصہ لینے کے حقدار ہونگے۔ اس تبدیلی کا اثر واضح کرنے کے لیے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

مثال ۱۔ جمیل کے دو بھائی اور ایک بہن زندہ ہیں (والدین اور اولاد زندہ نہیں) تیسرا بھائی اس کی وفات سے قبل فوت ہو چکا تھا اور اس کی اولاد ہے۔ شکل ۱۲ کے لحاظ سے موجودہ شرعی قانون اعظم اور شرفا اور بانو میں پورا ترکہ تقسیم کر دیگا اور ابراہیم (بھتیجا) اور خاتون (بھتیجی) اور اصغری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

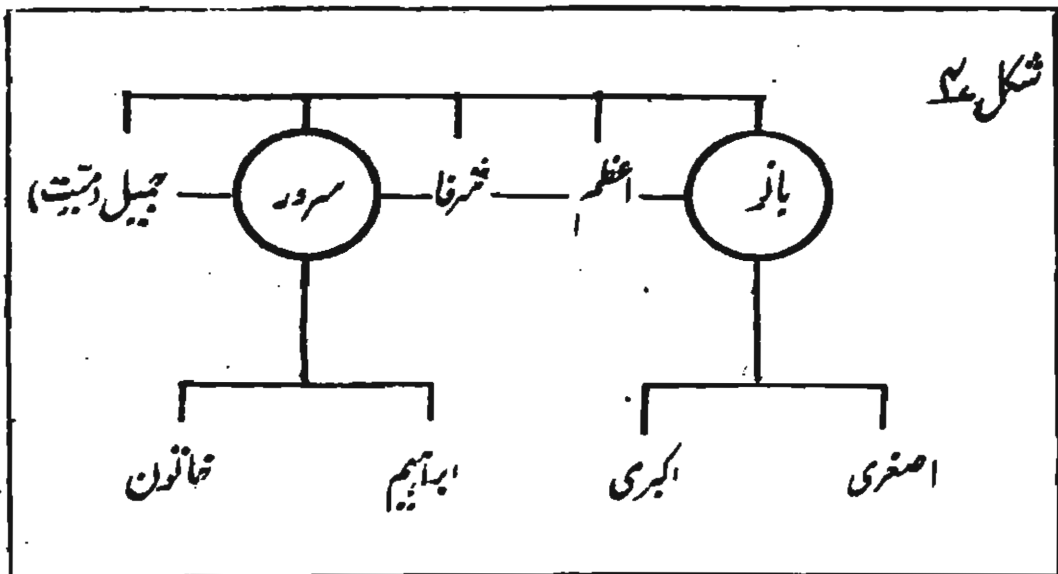

اور اکبری (بھانجیاں) کچھ نہ پائیں گی۔ بخلاف اس کے نئی اصلاح جو تجویز کی جا رہی ہے وہ اعظم اور ثمرآفا کے ساتھ ابراہیم، خاتون، اور اصغری و اکبری سب کو وارث بناتی ہے۔ بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھتیجوں بھتیجیوں اور بھانجوں بھانجیوں کا شریکِ میراث ہونا ہمارے نظامِ قانون کے لیے بالکل انوکھا تصور ہے۔

مثال ب۔ اوپر شکل ۱ میں ہم نے جو صورتِ مسئلہ پیش کی تھی اس میں اکبر کے زندہ حصہ کو پانے والے قائم مقام صرف اس کے بیٹے ص، ط، ع ہی نہیں، اس کی بیوہ بھی ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم نے اسے اس کا حصہ دیا۔ اب زید کی زندہ شوہروں والی دو بہوئیں تو محروم رہیں گی اور ایک بیوہ بہو ورثہ پائے گی۔ نیز زید کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے ان کی بھاوج کا شریکِ میراث ہونا پھر ایک ایسا واقعہ ہے جو اسلامی نظامِ وراثت میں قطعی طور پر نئی چیز ہے۔ اور فرض کیجیے کہ اکبر کی کوئی اولاد سرے سے موجود ہی نہیں، صرف ایک بیوہ ہے۔ یہ بیوہ اسلم اور اکرم کے ساتھ اکبر کی قائم مقامی کی بنا پر برابر کا حصہ پائیگی۔ کیا یہ ایک معقول قانون ہوگا جو بیٹوں اور بہو کو ہم مرتبہ کر دے؟ اور آگے چلیے، فرض کیجیے کہ زید کے پانچ بیٹے تھے جن میں چار لاولد صرف بیوائیں چھوڑ کر والد سے قبل وفات پا گئے، اور ایک زندہ ہے۔

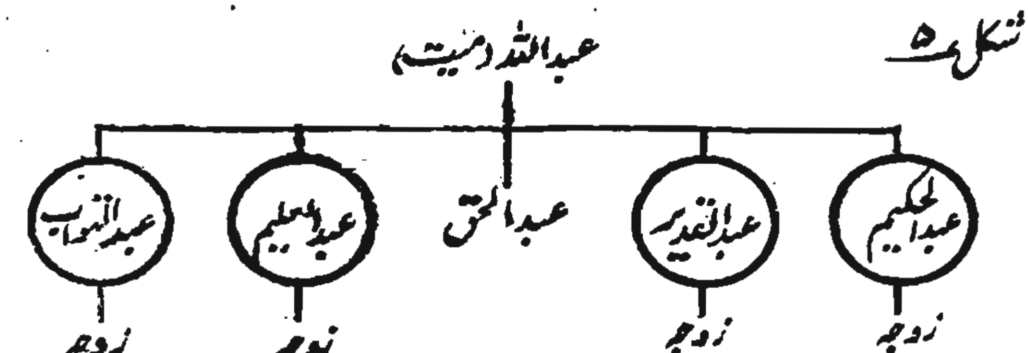

(نوٹ: قبل تقسیم ترکہ مرجانے والوں کے نام کے گرد دائرہ ہے)

اب چاروں بیوہ بہوؤں میں سے ہر ایک کو اس کے زندہ بیٹے کے مساوی حصہ ملے گا، حالانکہ اگر اس کی بیٹیاں بھی ہوتیں تو ان میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کوئی اپنے بھائی کے برابر حصہ نہ پا سکتی۔ بڑا معقول ہوگا وہ اجتہاد جو بہوؤں کو بیٹیوں سے بھی زیادہ اقرب بنا دے۔ ملاحظہ ہو شکل ۵۔ عبدالحق کے ساتھ بیوہ عبدالقدیر، بیوہ عبدالحکیم، بیوہ عبدالتواب، بیوہ عبدالعلیم بالکل مساوی درجہ کی حصہ دار ہیں۔ اب ۴/۵ ترکہ وہ لیں گی اور ۱/۵ عبدالحق کو ملے گا۔ اس فرق کو شکل ۶ مزید واضح کرے گی۔ عبداللہ کے ترکہ میں دو حصہ دار ٹھیرے۔ ایک نیاز بانو، دختر، دوسرے بیوہ عبدالحق بحیثیت قائم مقام عبدالحق — اور لطف یہ کہ بیٹی سے بہو کا حصہ دگنا ہو گیا۔

شکل ۶

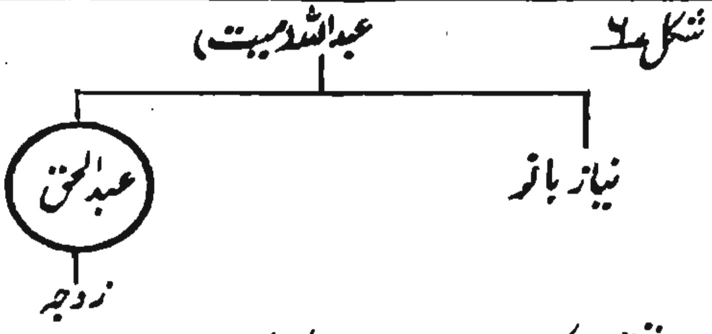

قبل تقسیم ترکہ فوت ہونے والوں کے گرد دائرہ ہے۔

مثال ج۔ کسی میت کی بیوی کے ہوتے ہوئے اگر ایک ہی بیٹا زندہ ہو، اور چار اس کی وفات سے قبل وفات پا چکے ہوں اچلہے انہوں نے چند منٹ ہی کے لیے زندگی پائی ہو، تو موجودہ شرعی قانون میں تقسیم یوں ہو گی:-

بیوہ کا حصہ = ۱/۸

بیٹے کا حصہ = ۷/۸

شکل ۷

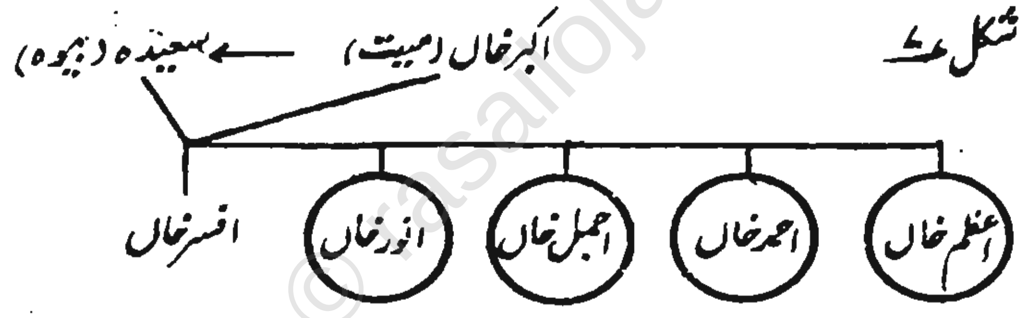

(نوٹ) قبل تقسیم ترکہ فوت ہو جانے والوں کے ناموں کے گرد دائرہ ہے۔

یعنی شکل ۷ کے بموجب ۱/۸ سعیدہ لے گی اور ۷/۸ افسر خاں کو ملے گا۔ لیکن نئی اجتہادی صورت میں تقسیم یوں ہو گی:-

سعیدہ (بیوہ میت) کا اپنا حصہ = ۱/۸ (باقی = ۷/۸)

مردہ بیٹوں کا زندہ شمار کیا جانے والا حصہ = ۷/۸ کا ۴/۵ = ۷/۱۰

سعیدہ کے حصے میں مردہ بیٹوں کی قائم مقامی کی وجہ سے مزید حصہ ملا دیا = ۱/۸ + ۷/۱۰ = ۳۳/۴۰

© rasailojaraid.com

میت کے زندہ بیٹے افسر خاں کا حصہ جو باقی رہا $= \frac{۷}{۸} \times \frac{۱}{۵} = \frac{۷}{۴۰}$

پہلے ماں بیٹے کے حق میں علی الترتیب ۱ : ۷ کا تناسب تھا، اب الٹ کر ۳۴ : ۷ ہو گیا۔

شکل ۸

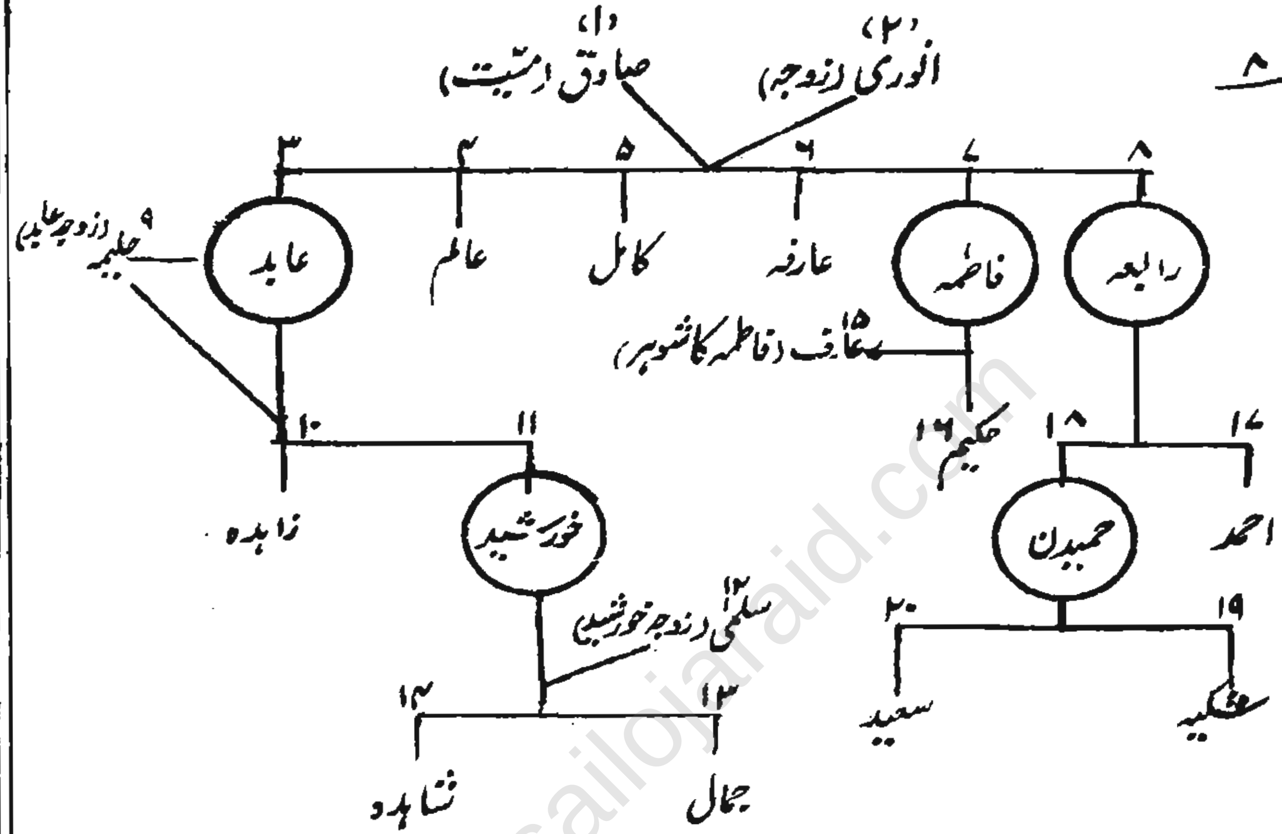

قبل تقسیم ترکہ فوت ہونے والوں کے ناموں کے گرد دائرے ہیں۔

مثال ۵۔ بصورت موجودہ صادق کے ترکہ کی تقسیم یوں ہوگی:-

انوری زوجہ صادق (۲) = کل کا $\frac{۱}{۸}$ (بقیہ $\frac{۷}{۸}$ اولاد میں)

عالم بیٹا (۴) کو $= \frac{۷}{۲۰}$

کامل بیٹا (۵) کو $= \frac{۷}{۲۰}$

عارفہ بیٹی (۶) کو $= \frac{۷}{۴۰}$ باقی کسی کو کچھ نہیں ملے گا

جدید مجوزہ صورت میں یہ تقسیم یوں ہوگی:-

صادق کی زوجہ انوری (۲) کو $= \frac{۱}{۸}$

© rasailojaraid.com

بقیہ $\frac{۷}{۸}$ کی تقسیم اولاد میں :—

عالم (۴) کو $= \frac{۷}{۳۶}$

کامل (۵) کو $= \frac{۷}{۳۶}$

عارفہ (۶) کو $= \frac{۷}{۷۲}$

عابد مرحوم(۳) کا حصہ $= \frac{۷}{۳۶}$

فاطمہ مرحومہ (۷) " $= \frac{۷}{۷۲}$

رابعہ " (۸) " $= \frac{۷}{۷۲}$

} یہ حصے زندہ رکھ کر ان تینوں کے قائم مقاموں میں تقسیم کئے جائیں گے

عابد کے زندہ حصے کی تقسیم اس کے قائم مقاموں میں :-

ماں انوری (۲) کو $= \frac{۷}{۳۶} \times \frac{۱}{۶} = \frac{۷}{۲۱۶}$

حلیمہ زوجہ عابد (۹) کو $= \frac{۷}{۳۶} \times \frac{۱}{۸} = \frac{۷}{۲۸۸}$

} باقی بچا $= \frac{۱۱۹}{۸۶۴}$

زاہدہ (۱۰) کو $= \frac{۱۱۹}{۸۶۴} \times \frac{۱}{۳} = \frac{۱۱۹}{۲۵۹۲}$

خورشید مرحوم (۱۱) کا حصہ $= \frac{۱۱۹}{۸۶۴} \times \frac{۲}{۳} = \frac{۱۱۹}{۱۲۹۶}$

} یہ حصہ زندہ رہ ہو کر آگے خورشید اور زاہدہ کے قائم مقاموں میں تقسیم ہوگا :-

خورشید مرحوم کا حصہ اس کے قائم مقاموں میں یوں تقسیم کیا جائے گا :-

خورشید کی والدہ حلیمہ (۹) کو $= \frac{۱۱۹}{۱۲۹۶} \times \frac{۱}{۶} = \frac{۱۱۹}{۷۷۷۶}$

خورشید کی زوجہ سلمیٰ (۱۲) کو $= \frac{۱۱۹}{۱۲۹۶} \times \frac{۱}{۸} = \frac{۱۱۹}{۱۰۳۶۸}$

} باقی بچا $= \frac{۲۰۲۳}{۳۱۱۰۴}$

جمال (۱۳) کو $= \frac{۲۰۲۳}{۳۱۱۰۴} \times \frac{۲}{۳} = \frac{۲۰۲۳}{۴۶۶۵۶}$

شاہدہ (۱۴) کو $= \frac{۲۰۲۳}{۳۱۱۰۴} \times \frac{۱}{۳} = \frac{۲۰۲۳}{۹۳۳۱۲}$

اب ہم فاطمہ مرحومہ (۷) کا زندہ شمار کیا ہوا حصہ اس کے قائم مقاموں میں تقسیم کرتے ہیں :-

فاطمہ کی والدہ انوری (۲) کو $= \frac{۷}{۷۲} \times \frac{۱}{۶} = \frac{۷}{۴۳۲}$

فاطمہ کے شوہر عارف (۱۵) کو $= \frac{۷}{۷۲} \times \frac{۱}{۴} = \frac{۷}{۲۸۸}$

فاطمہ کے بیٹے حکیم (۱۶) کو $=$ باقی کل $\frac{۴۹}{۸۶۴}$

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب رابعہ مرحومہ (۸) کا زندہ شمار کیا ہُوا حصّہ یوں تقسیم ہوگا :-

رابعہ کی والدہ انوری (۲) کو = $\frac{۷}{۷۲} \times \frac{۱}{۶} = \frac{۷}{۴۳۲}$ [باقی بچا = $\frac{۳۵}{۴۳۲}$]

احمد (۱۷) کو = $\frac{۳۵}{۴۳۲} \times \frac{۲}{۳} = \frac{۳۵}{۶۴۸}$

حمیدن (۱۸) کا زندہ حصہ = $\frac{۳۵}{۴۳۲} \times \frac{۱}{۳} = \frac{۳۵}{۱۲۹۶}$] یہ حصہ حمیدن کے قائم مقاموں میں بٹے گا۔

اب حمیدن (۱۸) کا حصہ اس کے قائم مقاموں کو یوں دیا جائے گا[1]:-

شکیلہ (۱۹) کو = $\frac{۳۵}{۱۲۹۶} \times \frac{۱}{۳} = \frac{۳۵}{۳۸۸۸}$

سعید (۲۰) کو = $\frac{۳۵}{۱۲۹۶} \times \frac{۲}{۳} = \frac{۳۵}{۱۹۴۴}$

اب ذرا ان حصہ داروں کے حصے پر نظر ثانی بھی کر لیجیے جن کو ایک سے زیادہ مرتبہ حصے ملے ہیں :-

۱- انوری زوجہ صادق (۲) کو شوہر سے = $\frac{۱}{۸}$
〃 〃 عابد کے حصے سے = $\frac{۷}{۲۱۶}$
〃 〃 فاطمہ 〃 〃 〃 = $\frac{۷}{۴۳۲}$
〃 〃 رابعہ 〃 〃 〃 = $\frac{۷}{۴۳۲}$

میزان = $\frac{۴۱}{۲۱۶}$

۲- حلیمہ (۹) کو شوہر مرحوم کے حصے سے = $\frac{۷}{۲۸۸}$
〃 〃 خورشید 〃 〃 〃 = $\frac{۱۱۹}{۷۷۷۶}$

میزان = $\frac{۷۷}{۱۹۴۴}$

اب دیکھیے کہ اس دلچسپ تقسیم نے کیا کیا گُل کھلائے ہیں :-

۱- صادق کی بیوی کو عام حالات میں $\frac{۱}{۸}$ ملتا، مگر اب وہ بیٹوں کے ہوتے ہوئے $\frac{۴۱}{۲۱۶}$ پا رہی ہے جو براہِ راست نصِ قرآنی کے خلاف ہے۔

۲- صادق کی بیوی کے پہلو بہ پہلو اس کی بہو حلیمہ (۹) اور اس کی پڑبہو سلمٰی (۱۲) وارث ٹھہری

[1] ایک قابلِ غور سوال یہ بھی ہے کہ حمیدن مرحومہ (۱۸) کے قائم مقاموں میں اس کی والدہ رابعہ (۸) کیوں نہ شمار کی جائے، جبکہ مرحوم ورثا کا حصہ زندہ تسلیم کیا جائے، اور اسی طرح دوسرے موقعوں پر بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ بیوی کے ساتھ بہوؤں کا وارث ہو جانا آج سے پہلے شریعت میں نامعلوم تھا۔

۳۔ صادق کے بیٹوں کے ساتھ اس کے پوتے پوتیاں بھی، پڑپوتا اور پڑپوتی بھی، نواسا، پڑنواسا اور پڑنواسی بھی شریک ترکہ ہو گئے۔ اس طرح ایک نئی شریعت وجود میں آتی ہے، نہ کہ اجتہاد!

۴۔ صادق کے بیٹوں عالم (۴) اور کامل (۵) کے ساتھ عارف داماد (۱۵) جو ان دونوں کا بہنوئی ہے، صادق کے ترکہ کا حقدار بن گیا۔

۵۔ مجموعی فساد یہ رونما ہو گیا کہ ذوی الفرائض اور اولوالارحام باہم بالکل گڈمڈ ہو گئے۔

۶۔ عصوبت کا سرے سے وہ تصور ہی کالعدم ہو گیا جو نص صریح پر مبنی تھا۔

یعنی آپ چلے تھے محض ایک پوتے کے لیے گنجائش پیدا کرنے کو، لیکن اس مقصد کے لیے "قائم مقامی" کے نظریہ کے تحت مردہ وارثوں کے حصص زندہ فرض کرنے کا فارمولا جو اختیار کیا تو اس نے شریعت کے قانون کے سارے ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اتنا ہی نہیں خود نصوص مجروح ہو گئیں پھر کیا اس نظریہ کی کوئی جگہ یہاں نکلتی ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ حدیث سے انکار کر کے صرف قرآن کو اگر کوئی شخص اوسط درجے کی عقل (COMMANSENSE) کا استعمال کر کے بھی مسائل میراث پر منطبق کرے گا تو اس درجہ کی بچگانہ نقہ تو پھر بھی پیدا نہ ہو گی۔

مذکورہ بالا صورتیں جو مجوزہ نظریہ کے تحت پیدا ہوتی ہیں، ان کے لیے سنت کا انکار کرنے والے، عام تاریخ امت کے مواد کو کھنگال کر کوئی ٹوٹی پھوٹی ایک آدھ نظیر تو ایک ایک صورت کے لیے سامنے لائیں۔ کسی شوریٰ کا فیصلہ، کسی خلیفہ راشد یا کم سے کم سلطان عادل کا فرمان، کسی عدالت کا فیصلہ، کسی مستند قانون دان کی علمی رائے، کسی فقہی اسکول کے تحقیقی ادارات کا فتویٰ! کچھ تو ہونا چاہیے۔

مثال د۔ خاندان ع۱ کا مورث اعلیٰ وفات پاتا ہے۔ موجودہ شرعی قانون کے تحت اُس کا کُل ترکہ اُس کا واحد زندہ بیٹا طٰہٰ بوجہ عصوبیت لے گا۔ اور کسی کا کوئی حق نہیں لیکن نئی اجتہادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورت میں طٰہٰ کو ۲/۵ ملے گا، دوسرا ۲/۵ مزمل مرحوم کا زندہ حصہ شمار ہو کر اس کی واحد قائم مقام بیوہ طاہرہ کو جا پہنچے گا اور اگر بالفرض طاہرہ بھی باقی نہ ہوتی تو یہ مریم کو جا ملتا۔ باقی رہا ۱/۵، سو یہ یٰسین کی مرحومہ بیٹی زلیخا کا زندہ حصہ شمار ہو کر اس کے

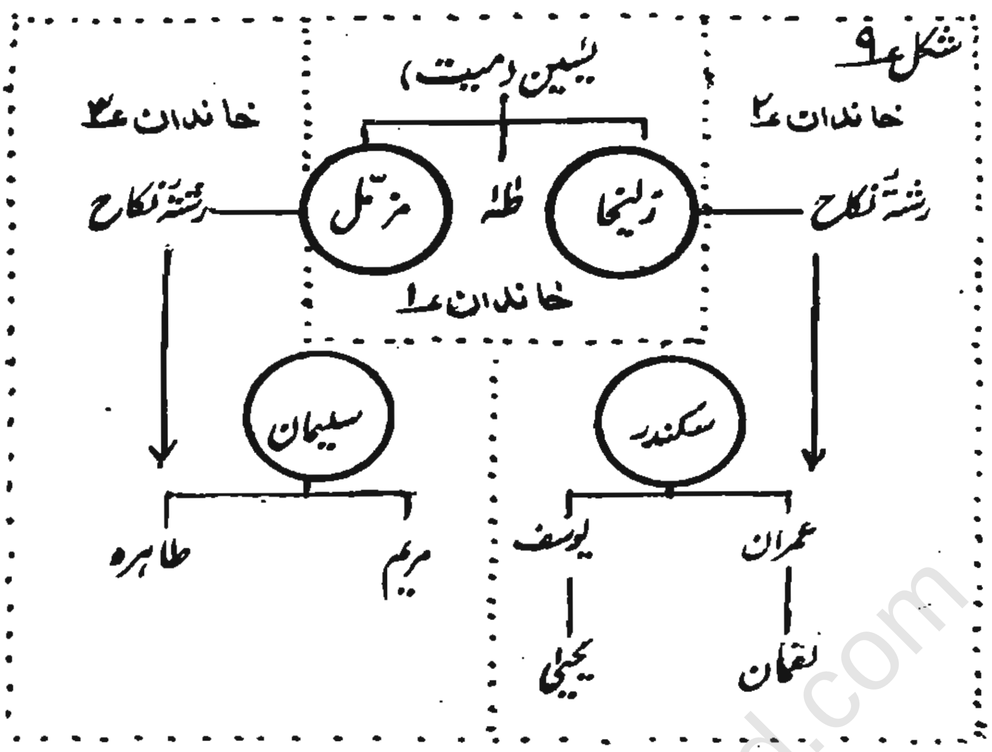

تقسیم ترکہ سے قبل مرجانے والوں کے ناموں کے گرد دائرہ ہے ۔

قائم مقام بیٹے لقمان کو (جو یٰسین کا نواسا ہے) جا پہنچے گا۔ اس طرح ایک خاندان کے اندر مرتبۂ عصوبت رکھنے والے قریب ترین وارث کی زندگی میں یٰسین کے ترکہ کا ۲/۵ بالکل ایک الگ خاندان میں اور دوسرا ۱/۵ بالکل ایک الگ خاندان میں دور پار کے ایسے عزیزوں کو جا ملے گا، جو سرے سے مرتبۂ عصوبت رکھتے ہی نہیں۔ پھر کیا یہ صورت مضحکہ خیز نہ ہوگی کہ طٰہٰ (بیٹا) اور طاہرہ (بہو) بالکل مساویانہ حصہ پائیں، حالانکہ طاہرہ اگر یٰسین کی بیٹی بھی ہوتی تو ۱/۵ سے زیادہ نہ پاتی۔ خود زلیخا اگر زندہ ہوتی تو اسے ۱/۵ ملتا، مگر کمال ہے اجتہاد کا کہ اب طاہرہ رشتۂ بعید رکھنے کے باوجود ۲/۵ پا رہی ہے۔ گویا اب وہ یٰسین کی بہو نہیں، اس کا ایک بیٹا بن گئی ہے۔ اسی طرح لقمان زلیخا کی قائم مقامی کی وجہ سے بالکل طٰہٰ کی بہن کا درجہ پا گیا۔ اور اگر لقمان بھی موجود نہ ہوتا تو یہی رتبۂ بلند یوسف کو ملتا، اور یوسف بھی مرگیا ہوتا تو یحییٰ اس کی جگہ لیتا۔ اسی طرح طاہرہ اگر زندہ نہ ہوتی تو اس کا مرتبہ مریم پاتی۔ خاندان ۱ کے زندہ بیٹے کے ہوتے ہوئے ۳/۵ جائداد کا بالکل الگ دو خاندانوں میں جا پہنچنا، یہ شرعی قانون کا کرشمہ ہوگا یا بچوں کا کھیل!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مثال ۳۔ یتیم پوتے کو ایک تو دادا سے میراث دلوائی گئی، لیکن دادا مرحوم سے جو ترکہ اس کی دادی نے پایا ہو، دادی کی وفات پر پھر اس میں سے یتیم کو اپنے باپ کی قائم مقامی کے فارمولے کے تحت ایک حصہ اور دلوانا ہوگا۔ اور اگر اس کے کسی چچا کی اولاد ختم ہو گئی تو اس کے مرنے پر جہاں اُس کا زندہ بھائی ترکہ پائے گا وہاں اس یتیم کو بھی چچا کے مرحوم بھائی کا حق بطور قائم مقام کے دینا چاہیے۔ پھر اس کی ماں بھی مر گئی ہو تو بعد میں جب کبھی اُس کا نانا، یا نانی فوت ہو تو ماں کی قائم مقامی کی وجہ سے اسے پھر حصہ دینا ہوگا۔ پھر اگر اس کی خالہ یا پھوپھی (کلالہ ہونے کی صورت میں) فوت ہو تو اس کی طرف سے بھی اس کے ماں اور باپ کا حصہ زندہ ہو کر محسوب ہوگا! اسی طرح ترکہ کی تقسیم جب بھی عمل میں آئے گی تو مُردہ اعزہ بار بار اوپر سے نیچے کو بھی اور نیچے سے اوپر کو بھی، اور دونوں پہلوؤں میں بھی شمار ہونگے اور ان کے حصے بار بار محسوب کر کے ان کے قائم مقاموں میں بانٹنے ہونگے۔ انشاء اللہ ریاضی کی ہر پیچیدہ سے پیچیدہ کسر استعمال میں آئے گی اور یہاں تک کہ تقسیم اشیاء کا معاملہ اجزائے لایتجزیٰ تک جا پہنچے گا۔ اور چیزوں کے ایٹم گن گن کر بانٹے جائیں گے، (آخر یہ دَور بھی تو ایٹم کے کرشموں کا دَور ہے!) پھر تو تمام دنیا میں اس اجتہاد کے ڈنکے بج جائیں گے، اسلامی قانون کی بڑی قدر و قیمت ہو گی، اور ملاؤں کی "حماقتوں" کی اصلاح کرنے والے "مسٹروں" کے دماغوں کو سونے میں تولا جائے گا۔

ایک اہم حدیث لیکن ابھی ایک اور استدلال بھی ہے، بظاہر بڑا وزنی! بخاری کی ایک مضبوط روایت ہے کہ مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے سامنے کوفہ کی گورنری کے زمانے میں یہ دریافت طلب مسئلہ رکھا گیا کہ ایک شخص مر گیا ہے جس کی ایک لڑکی، ایک پوتی اور ایک بہن موجود ہیں ان میں سے کس کو کتنا حصہ ترکہ میں سے ملے گا۔ آپ نے جواب دیا کہ لڑکی کو ½، بہن کو ½ دیا جائے، پوتی محروم ہے۔" لیکن سائل کو مشورہ دیا کہ وہ

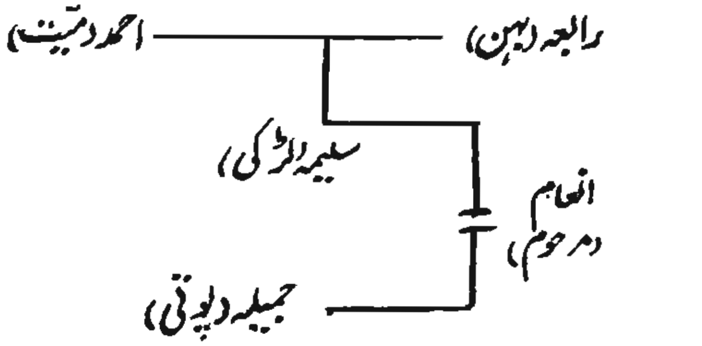

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قانون میراث کے ماہر خصوصی (SPECIALIST) حضرت ابن مسعودؓ سے بھی جا کر دریافت کرے۔ وہ حضرت ابن مسعودؓ کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے فتوے کی تائید کرنے سے معذرت کی۔ پھر فرمایا کہ خود نبی صلعم نے اس مسئلہ کو یوں حل فرمایا کہ لڑکی (سلیمہ) کو ترکہ کا $\frac{1}{2}$، پوتی (جمیلہ) کو $\frac{1}{6}$ اور مابقی $\frac{1}{3}$ بہن (رابعہ) کو دیا جائے۔ سائل پلٹ کر پھر حضرت ابوموسیٰ اشعری کے سامنے حاضر ہوا اور حضرت ابن مسعود کا فتویٰ ان کے سامنے رکھا۔ اس پر انہوں نے اپنا فتویٰ واپس لیتے ہوئے کہا کہ اس فاضل فن کے موجود ہوتے ہوئے مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔

واضح رہے کہ اس حدیث کی صحت پر کامل اتفاق ہے۔

کہا جا سکتا ہے اور ضرور کہا جانا چاہیے کہ جب بیٹی کی موجودگی میں پوتی کو میراث مل سکتی ہے تو ٹھیک اسی کے مطابق بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو بھی ملنی چاہیے۔

ہم مان لیں گے، لیکن پہلے تحقیق یہ کرنا ہے کہ یہ تقسیم کس فارمولے کے تحت ہے۔ اگر فارمولا وہی ہے جسے آپ بیٹے اور پوتے کے معاملے میں نافذ کرنا چاہتے ہیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ لیجئے اب حدیث مذکورہ کی مثال پر آپ کا فارمولا چسپاں کر کے دیکھیں۔

سلیمہ کے ساتھ ہم نے انعام کا حصہ زندہ فرض کیا تو تقسیم یوں ہوئی:۔

سلیمہ (لڑکی) = $\frac{1}{3}$

انعام مرحوم (لڑکا) = $\frac{2}{3}$ (یہ حصہ زندہ رکھا گیا)

اب ہم انعام کا قائم مقام ڈھونڈنے نکلے تو ہمیں جمیلہ ملی۔ لہٰذا جمیلہ کو $\frac{2}{3}$ ملے گا۔ لیکن کیا یہ تعجب کا مقام نہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری تو پوتی کو سرے سے محروم رکھ رہے تھے، اور پھر جس حدیث کے منصوص حکم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے فتوے کو منسوخ کر دیا وہ بھی پوتی کو $\frac{1}{6}$ دیتی ہے، اور آپ کا جدید اجتہادی فارمولا اپنی چُول نہ اُس شکل سے ملاتا ہے، نہ اِس شکل سے!

پھر کیا آپ حدیث صریح اور متفق علیہ کے مقابلے میں اپنے اجتہاد کا جھنڈا گاڑ کے کھڑے ہو جائیں گے اور جو قانون سازی آپ فرمائیں گے وہ اسلامی فقہ و قانون کی تعریف میں آئے گی۔ سوچئے، فارمولا وضع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس حدیث کے سمجھنے میں کہیں آپ سے غلطی تو نہیں ہو رہی ؟ (ایک منکر حدیث یہاں آکر حدیث کو حجت ماننے سے انکار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رکھتا۔ وہ کہے گا کہ یہ روایات گروں کا نتیجۂ کاوش ہے، اسی لیے تو بات نہ اُدھر بنتی ہے، نہ ادھر، لیکن یہاں ہم حُجیتِ حدیث کی بحث چھیڑنے سے معذوری کا اظہار کرتے ہیں)۔

بنیادی غلطی لڑکی اور لڑکے کے معاملے کو ایک قرار دینے میں ہو رہی ہے۔ مثلاً جس طرح حدیث کی نظیر سے آپ نے استدلال کیا، کیا ویسا ہی استدلال یہ بھی نہیں کہ جب لڑکی اور پوتی کے ہوتے ہوئے بہن کو حصہ ملتا ہے تو لڑکے اور پوتے کے موجود ہونے ہوئے بھی بہن (نیز بھائی) کو حصہ ملنا چاہیے لیکن جب تک قرآن اور حدیث اپنی اصلی شکل میں سامنے رہیں گے ایسا نہیں ہو سکتا۔ استدلال سرے سے غلط ہے۔

درحقیقت بیٹا عصبہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ذوی الفروض سے بچا ہوا (یا ذوی الفروض نہ ہوں تو کل) مال لے جاتا ہے۔ پھر کوئی بیٹا نہ ہو تو پوتا اسی مرتبۂ عصوبت پر آجاتا ہے لیکن بیٹی عصبہ نہیں ہے، نہ پوتی اس کے نہ ہونے کی صورت میں پوتے کا درجۂ عصوبت حاصل کرتی ہے بیٹی عصبہ ہوتی تو پوتی کا کوئی استحقاق نہ تھا، لیکن اسے صاحبۂ فرض ہونے کی حیثیت سے اکیلی ہونے کی صورت میں ½ مال دے کر جب ہم باقی کو ٹھکانے لگانے چلے تو وہ چونکہ عصوبت نہ رکھنے کی وجہ سے پوتی کے لیے اپنا مفروضہ حصہ لینے کے بعد بیٹے کی طرح کلیتہً حاجب نہیں ہے، اس لیے پوتی کے لیے گنجائش نکل آتی ہے چنانچہ اسے بروئے حدیث ⅙ دیا گیا اور اس طرح ترکہ کا جملہ ⅔ ٹھکانے لگ گیا جو دو بیٹیوں کے حصے کے مساوی[1] ہے۔

---

[1] پوتی کو یہاں بمنزلہ بیٹی کے لیا تو گیا ہے، مگر بالکل مساویانہ حیثیت میں نہیں، کیونکہ بلا واسطہ بیٹی ایک ہے اور اسی کا حصہ متعین ہے جو فرضیت رکھتا ہے۔ اس کا لحاظ ضروری تھا۔ مسئلہ کے حل میں خوبی یہ ہے کہ اس میں بیک وقت دو قاعدوں کو نافذ کر کے انہیں پورا کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ ایک بیٹی کو ½ ملے۔ دوسرے یہ کہ دو بیٹیوں کا ⅔ ہوتا ہے۔ چنانچہ بیٹی کو ایک ہونے کی وجہ سے ½ مل گیا اور پوتی کو ⅙ دینے سے بیٹی اور پوتی ⅔ میں جمع ہو گئیں۔ یہاں ہم مزید تفصیل نہیں دے سکتے۔

© rasailojaraid.com

ہے۔ مانحن کے لیے آنحضور صلعم کی طرف سے نص قطعی موجود ہے کہ "اجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ" پس بھائی نہ ہو تو بہن کو (واضح رہے کہ صرف بیٹیاں ہونے کی صورت میں) اس حدیث کے تحت عصبہ قرار دے کر ½ حصہ دے دیا جائیگا۔ یہی صورت تھی جسے حضرت ابن مسعودؓ نے اختیار فرمایا۔

اب خوب سمجھ لیجیے کہ یہ حدیث جسے آپ اپنے استدلال کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے، یہ قطعی طور پر آپ کے نظریے کی تردید کرتی ہے اور اس سے استدلال کرنے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ یہ زندہ چچاؤں کے ہوتے ہوئے یتیم پوتے کے وارث نہ بن سکنے کے لیے اپنے اندر دلیل پنہاں رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ کسی مردہ وارث کا حصہ زندہ رکھ کر اس کے قائم مقاموں کو پہنچانے والے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔

مسئلۂ زیر بحث میں بیٹی کی حیثیت فرضیت کے بخلاف زندہ بیٹے چونکہ عصبات ہوتے ہیں اور اقرب ترین، لہذا (ذوی الفروض کے بعد) وہ پورے کا پورا ترکہ لے جائیں گے اور ان کی عدم موجودگی میں ان سے پیچھے کی صفوں کے جو افراد عصوبت کے مقام پر آسکتے ہیں وہ ان کی زندگی میں کچھ نہ پائیں گے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کے ۱۲ بیٹوں میں سے ۱۱ یتیم اولاد چھوڑ کر مر گئے ہوں اور صرف ایک ہی زندہ باقی ہو تو اس کا کل ترکہ عصوبت کے مرتبۂ اوّل کی وجہ سے ایک ہی بیٹے کو مل جائے گا۔ ابن الابن کے ابن ہونے کا قاعدہ فقہاء نے وہاں استعمال کیا ہے جہاں مرتبۂ عصوبت پر کوئی ابن موجود نہ ہو۔ اس صورت میں تمام کے تمام پوتے عصوبت کے مساویانہ مرتبہ پر آجائیں گے، اور وہ نہ ہوں تو پڑپوتے وغیرہ!

صورت پنجم ـــ یہ ہے کہ آنکھیں بند کر کے اسلامی فقہ و قانون کے فنی مسائل کو سمجھے بوجھے بغیر اور کلیات اور قاعدوں کا لحاظ کیے بغیر ایک حل قانون سازی کے اختیارات کے بل پر شریعت پر ٹھونس دیں۔ اس جابرانہ صورت کا مقابلہ استدلال سے کرنا بیکار ہے۔ اس کا جواب صرف رائے عام کی قوت سے دیا جا سکتا ہے۔ یہ تو کھلم کھلا شارع کے احکام کو معطل کرنے کی اور شریعت کے قانون کو درہم برہم کرنے کی صورت ہے!

مسئلہ کا حل کیا ہے؟

مسئلہ کا حل قرونِ اولیٰ میں یتیم پوتے کی محرومی گذشتہ ۱۲ صدیوں میں بہرحال بارہا ایک واقعہ کی حیثیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں امت کے سامنے آئی ہو گی، لیکن کیا وجہ ہے کہ نہ اس مسئلے پر کوئی اضطراب پایا گیا ہے اور نہ کوئی مفصل اختلافی بحث ملتی ہے؟ اس کے دو وجوہ ہیں:۔

(۱) مسلمانوں کی پوری امت میں ایک طرف شریعت کے بارے میں پورا پورا جذبۂ احترام[1] کارفرما رہا ہے، یعنی جس مسئلے میں انہوں نے دیکھا کہ شریعت یوں کہتی ہے تو پھر اس کے اندر بظاہر کسی ناخوشگوار پہلو کے موجود ہوتے ہوئے بھی انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ دوسری طرف ان میں سنتِ نبوی کے شرعی حجت و سند ہونے پر ایمان کارفرما تھا اور کوئی گروہ ان کے اندر ایسا پنپ نہیں سکا جو سنت پر حملہ آور ہونے کے لیے قانونِ شرعی میں کیڑے ڈالنے کی جسارت کر سکتا، کہ جس سے متاثر ہو کر وہ ذہنی انتشار میں پڑ جاتے۔ تیسری طرف قانونیات کے دائرے میں وہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمۂ فقہا اور اپنے وقت کے علمائے قانون کے علم و تحقیق پر اعتماد رکھتے تھے اور یہ طرزِ فکر ان میں کبھی نہیں پایا گیا کہ وہ سرمایۂ فقہ و قانون کو چند ملاؤں کے تیر تکوں کا حاصل یا ایک عجمی سازش کا نتیجہ قرار دیں۔

یتیم پوتا اگر محروم رہ جاتا تھا تو مسلمانوں نے اس کے مسئلے کو سوسائٹی میں دوسرے بہت سے ورثہ نہ پانے والے تیامیٰ و ایامیٰ کے مسئلے کی سطح پر ہی رکھ کر حل کیا ہے۔ وہ اس طرح کی شاذ قابلِ رحم صورتوں کو دیکھ کر سنتِ نبوی یا سرمایۂ فقہ و قانون کے بارے میں شبہ میں نہیں پڑے۔

گویا اپنے دین کا پورا شعور، سنت پر ایمان، اجماع کا احترام اور قانونیات میں ماہرینِ فن کے علم و تحقیق پر اعتماد رکھنے کے لحاظ سے جب تک سوسائٹی تربیت یافتہ رہی، تو یہ مسئلہ اس طرح فتنہ کی صورت اختیار کر کے کبھی سامنے نہیں آیا۔ اور اب تربیت کا یہی خلاء ہے جو مذہبی فتنہ گروں کو سنت اور فقہ و قانون کے خلاف معرکہ آرائی تک کا موقع دے رہا ہے۔

(۲) اسلام کے معیاری دور میں، بلکہ بگاڑ شروع ہونے کے بعد تک بھی مسلم معاشرے میں یتیم پوتے کے مسئلے کے مناسب حل عملاً کارفرما رہے ہیں۔ یہ حل حسبِ ذیل تھے:۔

---

[1] اس جذبہ کو منکرینِ حدیث نے "افیون زدگی" سے تشبیہ دی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک یہ کہ اپنی ⅓ جائداد میں وصیت کا جو حق ہر شخص کو شریعت نے دیا ہے (اور جسے بعض علماء واجب بھی ماننے والے ہیں) اُس کا مدعا جہاں یہ تھا کہ مرنے سے پہلے آدمی سوسائٹی کی اجتماعی ضروریات کے لیے کچھ وقف چھوڑ جائے، اور یہ تھا کہ وہ ایسے اقربا کے خاص احسانات یا خدمات کا صلہ دے سکے جو اس کے وارث نہیں ہیں، وہاں بدرجۂ اتم یہ بھی تھا کہ قانون کے رُو سے جو اقربا محروم رہ جاتے ہیں لیکن وہ سہارے اور مدد کے محتاج ہوں اُن کے لیے سروسامان کیا جاسکے۔ اور وہ صالح جذبات کارفرما رہتے جو ان مقاصد کے لیے وصیت کرنے کے محرک ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ کوئی شخص جب اپنے ترکے سے بعض قریبی عزیزوں، خصوصاً یتیموں اور بیواؤں کی محرومی کا اندیشہ محسوس کرتا تھا تو وہ زندگی میں ہبہ کر کے اس اندیشے کا سدِ باب کر لیتا تھا۔

تیسرے یہ کہ جب کسی شاذ صورت میں بے سہارا یتیم پوتے پوتیاں دادا کی میراث سے محروم رہ جاتے تھے تو ان کی کفالت و سرپرستی کی ذمہ داری اُن کے چچاؤں پر عاید ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے چچاؤں کو یہ ذمہ داری اُٹھانے پر اپنے دورِ خلافت میں مجبور کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت حوالہ مستحضر نہیں۔ یہ اس لیے بھی مناسب ہے کہ ہر یتیم بچے کا دادا یا ہر یتیم بچے کا والد ضروری نہیں کہ میراث چھوڑ کر مرے۔ اکثر حالات میں یتیموں کی کفالت قریبی سرپرستوں پر لازم آئے گی۔

چوتھے یہ کہ یتیموں، بیواؤں اور عام بے سہارا لوگوں کے لیے ایک مستقل حل اسلامی بیت المال کا وجود تھا یعنی ہر بیکس بچے، بوڑھے یا عورت کی کفیل اور سرپرست اسلامی سوسائٹی اور اسلامی حکومت ہوتی تھی۔ اور وہ اپنے اجتماعی خزانے کے ذریعے اسے سنبھالتی تھی۔

اب آپ نہ تو مسلمانوں کی صحیح ذہنی تربیت ہی کا کوئی سامان کرتے ہیں، نہ سوسائٹی میں محروم رہنے والے اقربا کے لیے وصیت اور ہبہ کی ترغیب عام کرتے ہیں، نہ آپ یتیم پوتوں کے لیے چچاؤں کی کفالت بہم پہنچانے کی کوئی صورت پیدا کرتے ہیں، اور پھر نہ محرومین و معذورین کے لیے اجتماعی سہارا ہی بہم پہنچاتے ہیں۔ ان سارے خلاؤں کو جوں کا توں برقرار رکھ کر آپ پورا نہ ایک ایسی صورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مسئلہ حل کرنے پر صرف فرما سے ہیں جس کے لیے اسلامی قانون میں کھپت کی گنجائش بغیر اس کے ڈھانچے کو توڑے پیدا نہیں کی جا سکتی ـــــ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک خاص کیل یا پیچ کو کسی مشین میں نصب کرنے کے لیے پوری مشین کو چُور چُور کر کے مشین ہی ایک نئی بنا ڈالی جائے۔

قانون سازی کے ذریعے مسئلے کے حل کی مناسب صورتیں

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سوسائٹی کے موجودہ حالات کو مختلف پہلوؤں سے بدلنے میں وقت لگے گا، اور پیشِ نظر مسئلے میں ہمیں فوری قانونی حل مطلوب ہے۔ یہ قانونی حل چند ایسے طریقوں سے کیا جا سکتا ہے جو شرعی قانون کی مجموعی ساخت کو تباہ نہیں کرتے۔ بحالاتِ موجودہ ذیل کی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں:۔

(۱) ـــ یتیم پوتے کو دادا سے میراث دلوانے کے لیے ایک قانونی دروازہ قاعدۂ وصیت کے تحت کھولا جا سکتا ہے۔ اس کی نظیر مصر میں قائم ہو چکی ہے۔ حکومت مصر نے اس مسئلے میں انکارِ حدیث اور تخریبِ فقہ کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے علماء سے استصواب کیا اور علماء نے بالاتفاق ایک صورت تجویز کر دی۔ اس صورت کی بناء وصیت کے وجوب کے نظریے پر رکھی گئی جو پہلے سے ہمارے ایک نہ ایک فقہی مکتبِ خیال کے مختارات میں شامل رہا ہے۔ مصری قانون یتیم پوتوں وغیرہ کے ہونے کی صورت میں دادا کے لیے وصیت کو لازم سمجھ کر اس کی موت پر اس کے ترکہ کی ⅓ کی حد تک (کم از کم اتنی مقدار جتنی یتیم پوتوں کے والد کو ملتی) ان کے لیے وصیت کو موجود قرار دیتا ہے ـــ اگرچہ دادا یہ وصیت نہ کر سکا ہو۔ نیز اگر اس نے کسی وصیت کے ذریعے اپنے یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں وغیرہ کے علاوہ کسی اور رشتہ دار کو ترکہ کا حق دیا ہو تو یہ وصیت ⅓ ترکہ کے اس باقی کی حد تک پوری کی جاتی ہے جو یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں وغیرہ کو مذکورۂ بالا مقدم تر قانونی وصیت کے مطابق اُن کا حق ادا کرنے کے بعد بچ رہے۔ (ملاحظہ ہو: "المواریث الاسلامیہ" مؤلفہ احمد کامل دفعہ ۷۶ صفحہ ۲۸-۱۳۷۔ مطبوعہ ۱۹۵۰ء)

یہ معاملہ ہزار قابلِ بحث و اختلاف ہو، مگر اسلامی نظامِ فقہ میں چونکہ اس کی نظر مانی بنیاد موجود ہے، نیز اس سے کوئی قانونی کلیہ نہیں ٹوٹتا، اور یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کا وہی حصہ بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مل جاتا ہے جو کسی دوسری طرح دیا جائے تو کسی نہ کسی طرف سے شرعی قانون کے ڈھانچے کو ہر حال ضرر پہنچتا ہے۔

(۲) ـــــ لوگوں کے لیے اپنے ایسے عزیزوں کے حق میں جو ان کے ترکہ سے حصّہ نہ پانے والے ہوں، زندگی میں ہبہ کرنے کا جو دروازہ شریعتِ اسلامیہ نے کھول رکھا تھا اُس پر بھاری ٹیکسوں اور دوسری پابندیوں کے جو پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں، اُن کو ہٹا دینے کے لیے ترمیمی قانون سازی کی ضرورت ہے۔ وصیت سے بھی زیادہ بہتر شکل یہ ہے کہ دادا یا نانا اپنے یتیم پوتوں یا نواسوں کے لیے اپنی زندگی میں معقول بندوبست کر کے رخصت ہو۔

(۳) ـــــ بروئے قانون ہر یتیم پوتے یا نواسے ـــــ خصوصاً جو محروم الارث بھی ہو، یا جس کا دادا یا نانا کوئی جائداد رکھتا ہی نہ ہو ـــــ کی کفالت و سرپرستی کا بار چچاؤں یا ماموؤں پر ڈالا جانا چاہیے۔ اسی طرح دوسرے تمام تیامیٰ و ایامیٰ کے بارے میں اُن کے اقربا کی ذمہ داریاں کسی نہ کسی حد تک قانوناً طے کی جا سکتی ہیں۔ ایسا قانونی اقدام حضرت عمرؓ کی قائم کردہ نظیر پر مبنی ہوگا۔

(۴) ـــــ مذکورۂ بالا تدابیر میں سے ایک یا چند کے اختیار کرنے کے ساتھ بالکل متوازی طور پر جو چوتھی صورتِ اصلاح پیدا کی جانی چاہیے وہ یہ ہے کہ ملک کے تمام تیامیٰ، ایامیٰ اور معذوروں کے لیے حکومت کی طرف سے قانوناً کفالت کی ضمانت بہم پہنچائی جائے۔ اس کام کے لیے حاجت مندوں اور معذوروں کی لسٹیں بنا کر بجٹ میں باقاعدہ مدّ رکھی جائے۔ اور اگر سر دست اس ذمہ داری کو حکومت پوری وسعت کے ساتھ نہ سہار سکے تو (اقبال چیمہ صاحب جیسے مجسمہ ہائے رحم و شفقت) ذرا ہمت سے کام لیں تو کم سے کم محروم الارث رہ جانے والے یتیم پوتوں اور نواسوں اور بھتیجوں وغیرہ کے لیے (جو صوبے بھر میں بہت تھوڑی تعداد رکھتے ہونگے) سرکاری خزانے سے وظیفۂ کفالت (مع تعلیم و معالجہ کی سہولتوں کے) کا انتظام کر دیا جائے۔ اس معاملے میں صریح احادیث اور قطعی طور پر ثابت شدہ سنتِ نبوی دال ہے۔ آپؐ نے قرض چھوڑ کر مرنے والے، اور یتیم اور بیوائیں چھوڑ کر رخصت ہونے والے مسلمانوں کے بارے میں ساری ذمہ داری بحیثیت اسلامی ریاست کے کارپرداز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(HEAD) کے اپنے سر لی تھی۔ یہ ذمہ داری اب ہر اس مسلم حکومت پر عاید ہوتی ہے جو نبی صلعم کے دیئے ہوئے نظام کو چلائے۔

جس شریعت کے قانون کے زیرِ اثر کچھ یتیم محروم رہتے تھے اُس نے اُن یتیموں کے لیے انتظامات بھی کیے تھے۔ لیکن اُن انتظامات کو عمل میں لانے کی ذمہ داری تو ہماری حکومت کے کارپرداز سر لیں نہیں، اور پھر محرومی کے مسئلے پر ملاؤں کو کوسیں اور شریعت کے قانونی نظام کو درہم برہم کرنے پر اتر آئیں تو یہ دھاندلی معقولیت سے بہر حال کوسوں دُور ہے۔

ہم مذکورۂ بالا تدابیر کو پیش کر کے پوچھتے ہیں کہ کیا ان سے مسئلہ معقول طریق سے حل ہوتا ہے یا نہیں؟ پس اگر مدعا اس خاص مسئلے کا حل کرنا ہو، تو راستہ صاف ہے، لیکن اس مسئلے کی آڑ میں اگر نیت کچھ اور ہو تو اِس "کچھ اور" کو الگ زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے۔

اقبال چیمہ صاحب سے خصوصی گذارش

اوپر کے صفحات میں جو دلائل شرعی قانونِ وراثت کے بارے میں پیش کیے گئے ہیں، اگر آپ کو اس قانون کی بنیادوں اور مآخذ میں کوئی اختلاف نہ ہو تو نوعیتِ مسئلہ کو سمجھنے میں ضروری حد تک یہ مدد دے سکیں گے۔ اِن کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ قانون ایسا لامحدود میدانِ تگ و تاز فراہم نہیں کرتا کہ پروپگنڈے اور ووٹوں کی تعداد سے جو شے بھی کسی اسمبلی میں پاس کر ڈالی جائے وہ آپ سے آپ "قانونِ شرعی" قرار پائے۔ خدا اور اس کے رسول کے صریح احکام اور ان احکام کے واضح اشارات و دلالات (جن پر اجماع بھی ہے) کے مقابلے میں ان اسمبلیوں کا یہ اختیار سرے سے قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ وہ مجرد اکثریت کے بل پر جو چاہیں فیصلہ کر ڈالیں۔ ان کو بہر حال کتاب و سنّت اور اجماع کے حدود میں رہ کر کام کرنا ہوگا۔ لیکن اِن حدود کو اگر یہ توڑنے پر تُل جائیں اور شرعی مسائل میں اپنے آزادانہ فیصلے نافذ کریں تو اُس سے بہتر یہ ہے کہ قانونِ شریعت کو کھلم کھلا چھوڑ کر جس دوسری شریعت پر دل ٹھکے، اُسے اختیار کر لیں، یا جو نئی شریعت چاہیں بنائیں۔ ایسے آزادانہ فیصلوں سے قانونِ شریعت وجود نہیں پاتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کے ترمیمی مسودۂ قانون میں دو بنیادی غلطیاں ہیں:-

ایک یہ کہ شریعت اسلامیہ کے قانونِ میراث میں جدّی اور خود پیدا کردہ جائداد و املاک کی تمیز کا کوئی نشان نہیں ملتا، حالانکہ آپ دونوں میں فرق کر رہے ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع تینوں اس کے خلاف ہیں۔

دوسرے یہ کہ آپ کے الفاظ "... گویا کہ متذکرہ اشخاص آخری مالک کی وفات کے فوراً ہی بعد فوت ہوئے" میں جس مفروضہ کو واقعہ بنا کر قانون پر اثر انداز کیا گیا ہے، یعنی آخری مالک کی وفات سے قبل فوت ہونے والوں کا حق اس کے ترکہ میں قائم کیا گیا ہے، اس مفروضہ کو قرآن، حدیث یا اجماع تو کجا، کسی تیسرے درجے کی عدالتی نظیر یا کسی مفتی کے شخصی فتویٰ تک میں آج تک اس ڈھنگ سے استعمال نہیں کیا گیا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ کسی مورث کی زندگی میں کسی ممکن وارث کا حقِ وراثت اس کے املاک پر عائد نہیں ہوتا، اور نہ کسی متوفی کے ترکہ میں اُس سے قبل مرجانے والے کسی ممکن وارث کا حصّہ زندہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس فارمولے کو آپ نے ہندو رواجی قانون سے لیا ہو، یا فرانسیسی قانونِ وراثت سے اخذ کیا ہو، ہمارے نظامِ قانون کے لیے بہرحال بالکل اجنبی چیز ہے، جیسا کہ اوپر ہم واضح کر چکے ہیں۔

یہ غلطیاں اگر آپ محض اپنے دیہی علاقے کے ووٹروں (یا صوبے کے عوام) کو خوش کرنے کے لیے کر رہے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ خدا و رسول کی رضا کو قربان کر کے ووٹروں کو خوش کرنا شرک کی ایک بدترین صورت ہے، ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی ترمیم کے دُور رس اثرات یتیم پوتے کے علاوہ جب نواسوں نواسیوں اور بھتیجوں بھتیجیوں اور بھانجوں بھانجیوں، دامادوں اور بہوؤں کو بیٹوں کی موجودگی میں وارث بنائیں گے تو اُس وقت آپ کے ووٹر سر پیٹ لیں گے۔ بعید نہیں کہ یہ قدم آگے چل کر آپ کو واپس لینا پڑے۔

آخر میں ہم یہ بھی کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ چیمہ صاحب ہوں، یا کوئی اور بزرگ، انہیں مسلمانوں کی اکثریت کے نظامِ فقہ و قانون سے ذاتی طور پر کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، اور وہ منکرینِ حدیث بلکہ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منکرینِ دین کے نظریات پر ایمان کیوں نہ لے آئیں، قانون سازی کے اختیارات کو استعمال کرتے وقت ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ اختیارات ان کے پاس جس قوم کی طرف سے ایک مقدس امانت بنا کر سونپے گئے ہیں اُس کا مسلمہ نظامِ فقہ و قانون آپ کے پسندیدہ نظریے اور آپ کی مجوزہ ترمیم کے حق میں نہیں ہے۔ اب اگر اسمبلی میں شریعت پر اعتماد نہ رکھنے والے یا اس کو نہ جاننے والے لوگ محض اپنی اتفاقی اکثریت کے زور سے قوم پر منکرینِ حدیث کے نظریہ و مسلک کو منڈھ دیں تو یہ ظلم ہوگا، اور اس کے خلاف لازماً احتجاج کیا جائے گا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس نئے تصورِ شریعت کو آپ پسند کرتے ہوں، پہلے اُس پر رائے عام تیار کریں اور اسی کے نام پر منتخب ہوں، پھر آپ کو حق ہوگا کہ من مانی شریعت وضع کریں۔

بہتر یہ ہو کہ قانونِ شریعت کو آپ حضرات سیاسی مقاصد کی بساط کا داؤں نہ بنائیں۔ معقول طریقہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے ماہرین (جو مختلف مدرسہ ہائے فکر سے تعلق رکھتے ہوں) کی ایک مجلس منظم کرکے آپ اس قسم کے مسائل کو اس مجلس کے سامنے فکر و تحقیق کے لیے پیش کرنے کا راستہ نکالیں، تاکہ بات بات پر بے جا ذہنی کشمکش اور نظریاتی تصادم پیدا نہ ہو۔

© rasailojaraid.com